خاکہ اور سلوک و عرفان کی اصل حقیقت کا مرقع ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمہ میں سید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے جلووں اور مختلف النوع کمالات کے دلکش پہلوؤں کے ذکر کے سلسلہ میں ان کی سلوک و تصوف سے ابتدائی دلچسپی اور ان کی زندگی میں اس کے تدریجی ارتقار کا بھی ذکر کیا ہے۔ سید صاحب کے علوم ظاہری میں کمالات کے مقابلہ میں ان کی باطنی و روحانی زندگی کے گوشے نمایاں نہ تھے، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے، اور اس سے انکے روحانی و باطنی زندگی کے کمالات کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے، طرز تحریر دلکش ہے، غلام محمد صاحب نے معارف کے سلیمان نمبر کے متعلق غلطی سے لکھا ہے کہ یہ ستمبر ۵۴ء میں شائع ہوا تھا، یہ صحیح نہیں ہے یہ نمبر ۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

تعلیمی مقالات (۱) مرتبہ مجلس تعلیمات پاکستان تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۴۴ قیمت ۔/۶ پتہ مجلس تعلیمات پاکستان۔ ۵ علامہ اقبال روڈ (متصل کالج لاہور) وغیرہ

پاکستان کے ادارہ مجلس تعلیمات کا مقصد نظام تعلیم میں ایسی مفید تبدیلیاں عمل میں لانا ہے جو دین سے بے تعلقی اور دین و دنیا میں دوئی کے رجحان کو ختم کرکے طلبہ و اساتذہ کو اسلامی افکار و اقدار کا حامل بنا سکیں۔ اس ادارہ کی ماہانہ نشستوں میں مختلف علمی و تعلیمی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے ہیں، یہ مجموعہ ان نشستوں کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، یہ سب مضامین غور و فکر سے لکھے گئے اور بصیرت افروز ہیں، اور ان میں مختلف علمی و تعلیمی مسائل پر بہت مفید خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جن سے معاشرہ و افراد کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کی اہمیت اسکو زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کی تدبیریں اور درس و تدریس کے بارہ میں مفید رہنمائی ملتی ہے، ایک مضمون میں مسلمانوں کی ریاضی میں خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے "کیا درس نظامی محض ایک دینی نصاب ہے (حافظ نذر احمد) اور "بدعت اور تعلیم" (سید علی شبر کاظمی) خصوصیت سے مفید اور دلچسپ مقالے ہیں، یہ مجموعہ خصوصیت سے تعلیم و تدریس سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے، "ض"

جلد ۱۰۶۔ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

مشرقی پاکستان پر جو قیامت صغریٰ ٹوٹی ہے، اسکی تفصیلات اسقدر درد انگیز ہیں کہ انکے تصور سے روح لرز اٹھتی ہے، اور گذشتہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کی تاریخ نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس حادثہ نے عبرت و بصیرت کے دفتر کھول دیے ہیں، اس سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود آج کا انسان بھی قدرت کی قہرمانی قوتوں کے سامنے اتنا ہی بے بس ہے جتنا پہلے زمانہ کا انسان تھا، اس تباہی کی درد انگیزی کا اظہار قلم سے نہیں کیا جاسکتا، اسکی تلافی مدتوں میں ہوسکے گی، اللہ تعالیٰ اس مصیبت عظمیٰ میں پاکستان کی مدد فرمائے، اس حادثہ پر پوری دنیا خصوصاً امریکہ اور یورپ کے ملکوں نے جو عملی ہمدردی کی ہے وہ اسکا ثبوت ہے کہ انکی مادہ پرستی کے باوجود ان کے دلوں سے انسانیت کا چراغ گل نہیں ہوا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انکی مادہ پرستی سے قطع نظر ان میں بہت سے قابل تقلید اخلاقی اوصاف ہیں جن کی بدولت وہ زندہ ہیں، ہم کو ان اوصاف میں ان کی تقلید کی توفیق نہیں ہوتی ہے، ہم نقل بھی کرتے ہیں تو انکی برائیوں کی، اسلیے ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم ہیں جو انکو حاصل ہیں، اس موقع پر ہر قسم کے اختلافات کے باوجود حکومت ہند نے جس انسانی شرافت و ہمدردی کا نمونہ پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ خود پاکستانیوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، وہاں ان حالات میں بھی حصول اقتدار کی کشمکش جاری رہی اور مشرقی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں نے اس سے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور انکی زبانوں پر وہی شورش انگیز نعرے جاری رہے، ان سطور کی تحریر کے وقت پارلیمنٹ کا الیکشن ختم ہو چکا ہے، اور اسکے نتائج کا بھی اعلان ہو گیا ہے، اس کے دور رس نتائج کے متعلق ابھی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اتنا تو ظاہر ہو گیا کہ پاکستان اپنے اصل مقصد سے دور ہٹ گیا ہے، ڈکٹیٹر شپ کی مدت اب ختم ہو گئی جس کو ختم ہی ہونا چاہیے تھا اور جلد ہی جمہوری حکومت قائم ہو گی، لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جمہوریت کی ساری خوبیوں کے باوجود ہر ملک کیلیے ایک ہی قسم کی جمہوریت موزوں نہیں ہوتی، برطانوی طرز کی پارلیمنٹری جمہوریت پورے ایشیا میں ناکام ہو چکی ہے، صرف ہندوستان

میں یہ سسٹم چل رہا ہے، لیکن اسکے نتائج اور ملک کا انتشار دیکھکر اب بہت سے ہندوستانی مفکرین اسکو ملک کے لیے مفید نہیں سمجھتے، اسلیے پاکستان کو ان ملکوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور ایسا دستور بنانا چاہیے جس میں جمہوریت کے ساتھ ملک کی سالمیت اور طوائف الملوکی کے انسداد کا پورا لحاظ ہو اور وہ پاکستان کے دونوں حصوں کیلیے قابل قبول ہو۔

یورپ میں چھوٹے چھوٹے ملک ہیں، انکی آبادی سو فیصدی تعلیم یافتہ ہے، ان میں پورا سیاسی شعور اور نسلی و لسانی اور تہذیبی وحدت و یکرنگی ہے اور انکی جمہوریت بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد اس منزل پر پہنچی ہے، اسکے باوجود مختلف ملکوں میں انکے حالات کے لحاظ سے جمہوریت کی شکل مختلف ہے، پاکستان کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہے، اسلیے اسکے لیے برطانوی طرز کی جمہوریت کسی حیثیت سے بھی موزوں نہیں ہے، ان میں وحدت کا سب سے قوی رشتہ مذہب ہے جس کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا ہے، اسلیے اب صرف ملک کا مفاد وحدت کا رشتہ رہ گیا ہے، اگر اس پر بھی نسلی، صوبائی اور لسانی عصبیت غالب آگئی تو پھر کوئی طاقت پاکستان کو انتشار سے نہیں بچا سکتی، اس لیے اگر پاکستان کو ملک ان عصبیتوں سے زیادہ عزیز ہے تو دستور بنانے میں اسکا پورا لحاظ رکھنا چاہیے، اسوقت پاکستان کے لیے بڑا نازک مرحلہ آگیا ہے، اس میں اس کے تدبر کا امتحان ہے، دیکھنا ہے کہ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس امتحان میں اس کی مدد فرمائے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس دار المصنفین نے ۱۰۳ ممتاز اہل سنت کے دستخطوں سے شیعہ سنی اتحاد کیلیے جو اپیل شائع کی تھی، مسرت کا مقام ہے کہ شیعوں کی طرف سے اسکا پرجوش خیر مقدم کیا گیا، سرفراز اخبار نے اس اپیل کو شائع کیا اور اسکی پرزور تائید کی، سید کلب عباس صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے نہ صرف اسکی پوری تائید کی بلکہ اس کیلیے کچھ مفید تجویزیں بھی پیش کیں، اور ۱۰۳ شیعہ اکابر کے دستخطوں سے ایک اپیل شائع کی، اسی طرح کی ایک اپیل مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب مجتہد کامون پوری نے مسلم یونیورسٹی اور دوسرے مقامات کے ممتاز شیعوں کیجانب سے شائع کی، اس کے علاوہ بہت سے شیعوں نے اخبارات میں اسکی تائید کی، یہ اسکا ثبوت ہے کہ یہ اپیل وقت کی پکار ہے اور شیعہ سنی دونوں کا سنجیدہ اور سمجھدار طبقہ ان کے اتحاد کیلیے بے چین ہے، باقی کسی مسئلہ پر خواہ وہ کتنا ہی مفید ہو، سو فیصد اتفاق ہونا مشکل ہے، کچھ نہ کچھ اصحاب غرض اسکے مخالف نکل ہی آتے ہیں، لیکن اگر سنجیدہ طبقہ متفق و متحد ہے تو مخالفت کی آواز

کچھ دنوں میں خود بخود دب جاتی ہیں، اس لیے انشاء اللہ اس کار خیر میں دیر سویر ضرور کامیابی ہوگی۔

حکیم عبد الحمید صاحب عنا دہلوی، جن کا قدم ہر اچھے کام میں آگے رہتا ہے، کئی سال ہوئے اسلامیات کی تحقیقات کے لیے "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، جس کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، ابتک یہ ادارہ کرایہ کی عمارت میں تھا، جو اسکی ضروریات کے لیے ناکافی تھی، اب ان کو تغلق آباد میں حکومت سے مناسب قیمت پر تیس ایکڑ زمین مل گئی ہے، اور عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، حکیم صاحب نے اس کے لیے پندرہ لاکھ کی قیمتی جائداد وقف کرکے اس کا ٹرسٹ قائم کردیا ہے، اس ادارہ کے کاموں کا خاکہ اتنا وسیع ہے کہ اگر اسکے مطابق کام انجام پا جائیں تو یہ ادارہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرلے گا، مگر اس قسم کی کوششوں کے نتائج برسوں میں نکلتے ہیں، اسلیے اس ادارے سے بھی اسی کی توقع رکھنی چاہیے، اگر خاکہ میں درج شدہ کاموں کا ایک حصہ بھی پورا ہو جائے تو یہ بھی بڑا کام ہوگا، ہم اپنے معاصر اور ہم مشرب ادارہ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔

اس وقت ہندوستان کے اردو رسالوں میں سب سے سستا معارف ہے، اس مواد سے قطع نظر جو وہ پیش کرتا ہے، ضخامت کے لحاظ سے بھی، ۸۰ صفحوں کا ہوتا ہے اور اس سے کم صفحات کے رسالوں کی قیمت بھی دس روپے سالانہ سے کم نہیں ہے، کاغذ، کتابت، طباعت وغیرہ کے سامانوں کی روز افزوں گرانی تھی ہی، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ پاکستان نے اپنے یہاں ہندوستان کے ہر قسم کے لٹریچر کی بندش کردی، اب یہاں سے ایک مطبوعہ پرزہ بھی پاکستان نہیں جا سکتا، اس لیے ان تمام رسالوں کی جو پاکستان جاتے تھے، آمدنی اتنی گھٹ گئی ہے کہ ان کا قائم رہنا دشوار ہو رہا ہے، ان مجبوریوں کی بنا پر آیندہ جنوری سے معارف کی قیمت آٹھ کے بجائے دس روپے سالانہ کردی گئی ہے، امید ہے کہ معارف کے قدر دانوں پر یہ اضافہ گراں نہ گذرے گا، اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان والے یوں زبانی تو اردو کے لیے بہت شور مچاتے ہیں، لیکن اس کو زندہ رکھنے کی جو صورتیں ہیں، ان کو اختیار نہیں کرتے، معارف دار المصنفین کا ترجمان ہے، اس لیے اس کو بہر حال قائم رکھنا ہے، ورنہ وہ اپنی آمدنی سے نہیں چل سکتا، اردو والوں کے دامن پر یہ بدنما داغ ہے۔

مقالات

بانی درسِ نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری، استاذ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۶)

استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی ۱۱۰۵ھ ۱۶۹۳-۹۴ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً سولہ سال کی تھی، سہالی سے ترک وطن کرکے لکھنؤ کی "حویلی فرنگی" میں والدہ، دادی، دو بھاوجوں، دو بھتیجوں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ مقیم ہوئے، اور نئے وطن میں مستقل بود و باش کے تمام مراحل طے ہو جانے کے بعد ملا صاحب تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلے، تذکرہ نویسوں کے تخمینے کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں اور بعض قوی قرائن کے پیش نظر اکیس یا بائیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر ۱۱۱۲-۱۳ھ یا ۱۷۰۱-۲ء میں واپس فرنگی محل اپنی نئی رہائش گاہ آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ملا صاحب کی شادی کس عمر میں ہوئی؟ اس کی تفصیل جاننے کا اب کوئی ذریعہ ہماری دسترس میں نہیں ہے، صرف اتنا معلوم ہے کہ ملا صاحب کی شادی اپنے آبائی وطن قصبہ سہالی میں چودھری محمد آصف کی بیٹی سے ہوئی تھی، چودھری محمد آصف ملا نظام الدین محمد کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید پر دشمنوں کے حملے کی خبر سن کر نو آدمیوں کے ساتھ امداد

کو پہنچ تھے، اور مدرسہ ملا قطب الدین شہید کے سامنے ہی حملہ آوروں کی مدافعت کرتے ہوئے اپنے ہمراہیوں سمیت شہید ہو گئے تھے۔ (۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ / ۱۶۹۱ء)

ان اہلیہ سے ملا نظام الدین کے ایک اولاد ہوئی، جو صغر سنی ہی میں انتقال کر گئی (اغصان اربعہ) ملا صاحب کے برادر زادگان، ملا احمد عبد الحق (بن ملا محمد سعید) ملا عبد العزیز (بن ملا محمد سعید) ملا غلام محمد مصطفیٰ (بن ملا محمد اسعد) ملا عبد الحی (بن ملا محمد رضا) اور ملا احمد حسین (بن ملا محمد رضا) ہی ملا صاحب کی اولاد تھے، آخر الذکر بھتیجے ملا احمد حسین کو جو سب بھتیجوں میں چھوٹے تھے ملا صاحب نے متبنیٰ کر لیا تھا،

مولانائے عارف مولوی احمد حسین مرحوم	مولانا عارف (ملا نظام الدین محمد)
متبنیٰ کردہ بود،	نے مولوی احمد حسین مرحوم[1] (ابن ملا
(رسالہ قطبیہ قلمی)	محمد رضا) کو متبنیٰ کیا تھا،

اور یہ سب بھتیجے ملا صاحب کے سامنے ہی صاحب اولاد بھی ہو چکے تھے، وہ کنبہ جس کی سربراہی

۱؎ یہاں ضمناً یہ ذکر ضروری ہے کہ ملا احمد حسین کی وفات کی تاریخ اور زمانہ ابھی تک کہیں نظر سے نہیں گزرا تھا، رسالہ قطبیہ کے مصنف مولانا عبد الاعلیٰ کے ملا احمد حسین کو "مرحوم" لکھنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ زمانۂ تصنیف رسالۂ قطبیہ میں وہ انتقال کر چکے تھے، رسالہ قطبیہ کی تصنیف سنہ ۱۲۰۰ھ میں ہوئی، جیسا کہ ملا عبد الاعلیٰ (مصنف) نے وضاحت سے لکھا ہے :-

"قد فرغت من تسوید ہذہ الرسالۃ المتبرکۃ الموسومۃ بالقطبیۃ فی بیان احوال الفرق النظامیۃ عاشر محرم الحرام سنۃ الف و مائتین ۱۲۰۰ھ من ہجرۃ النبی الاکرم"

(اس رسالہ کی تالیف سے جس کا نام "القطبیۃ فی بیان احوال الفرق النظامیہ" ہے دسویں محرم سنہ ۱۲۰۰ھ میں فرصت پائی)

ملا نظام الدین پر سولہ سال کی عمر میں آ پڑی تھی، ان کی نگاہوں کے سامنے پھل پھول رہا تھا، لیکن ملا صاحب کے مخلصین کے دلوں میں یہ تمنا ضرور مچل رہی تھی کہ ملا صاحب سے صلبی سلسلہ بھی اسی طرح جاری ہو، جس طرح علمی فرزندوں سے ان کا علمی سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے، بلکہ خود ملا صاحب بھی بشری تقاضے کے تحت اپنی بے اولادی سے ملول رہتے تھے، :-

ازیں جہت بمقتضائے بشریت رنجیدہ	بشری تقاضے کے تحت رنجیدہ اور
خاطر می ماند، و از برادر زادہ خود ملا	ملول رہتے تھے، اور اپنے بھتیجے ملا احمد
احمد عبد الحق قدس سرہٗ اکثر می فرمود	عبد الحق قدس سرہ سے اکثر فرمایا کرتے
کہ باوجودیکہ اولاد برادران و فرزندان	تھے کہ بھائیوں کی اولاد اور ان کی
شان فرزندان من اند، لاکن دل ہمیں	اولاد کے بچے میرے ہی بچے ہیں، پھر
می خواہد کہ یکے از نژاد	بھی یہ دل چاہتا ہے، کہ ایک اولاد
خودم باشد،	میری بھی ہو،
او شاں عرض کردند کہ اگر از زوجہ	بھتیجے (ملا احمد عبد الحق) نے عرض
اولیٰ فرزند متولد نمی شود زوجۂ دیگر	کیا کہ ان بیوی سے اگر اولاد نہیں ہے تو
باید کرد شاید حق تعالیٰ از و عطا	دوسرا عقد کر لیا جائے اللہ چاہے گا
فرماید،	تو اس سے فرزند عطا فرمائے گا۔
فرمود عالم الغیب خدائے تعالیٰ ست بر من در	ملا صاحب نے جواب میں فرمایا
عالم رویا ہیچ منکشف نگشتہ ازیں جہت	کہ غیب کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی
جرأت بایں امر نمی توانم و خود	جاننے والا ہے، اس سلسلے میں عالم
را مورد و مہلکہ و فساد نمی گردانم تا وقتیکہ	رویا میں مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا ہے

کدام بزرگے کہ بر وا عتماد من باشد
ازیں معنی خبر نخواہد داد و ارتکاب
ایں امر نخواہم کرد،

تا حضرت سید میر محمد اسماعیل بلگرامی
قدس سرہ برموز باطن مولانا مطلع
گشتہ واز درگاہ الٰہی ملہم گشت کہ از
زوجۂ دیگر فرزنداں بوے میسّر
خواہند گشت، سید صاحب ازیں
معنی مولانا را خبر دادہ تا در اواخر
عمر مولد شد، و کتخدا گشت در
قصبہ سترکھ نکاح دیگر کرد و حق
تعالیٰ از بطن ایں زوجہ یک پسر عطا
فرمود کہ اورا بہ عبد العلی محمد موسوم گردانید
و یک صبیہ متولد شد،

(اغصان اربعہ)

اس کیے میں اس معاملے (عقد ثانی)
میں اقدام نہیں کر سکتا، اور خود کو
جھگڑے فساد کا نشانہ نہیں بنا
سکتا، جب تک کوئی ایسا بزرگ
جس پر مجھے اعتقاد ہو، اس سلسلے
میں کوئی (الہامی) خبر نہ دے گا
میں عقد ثانی کرنے کا ارتکاب کرونگا
یہاں تک کہ حضرت میر محمد اسماعیل
بلگرامی قدس سرہٗ، ملا صاحب کے
مکنون خاطر سے باخبر ہوئے، اور درگاہ
الٰہی سے ان کو الہام ہوا کہ ملا صاحب
کی دوسری شادی سے اولاد ہوگی،
یہ الہامی اشارہ حضرت میر سید اسماعیل
بلگرامی نے ملا صاحب سے کہلوا دیا،
پھر آخر عمر میں آمادہ ہو کر ملا صاحب
نے دوسرا نکاح قصبہ سترکھ میں کیا
ان دوسری بیوی سے اللہ تعالیٰ
نے ان کو ایک فرزند جن کا نام
عبد العلی ہے اور ایک بیٹی عطا فرمائی،

اور یہ صاحبزادے جن کو دنیا بحر العلوم کے نام سے یاد کرتی ہے، اپنے نامور والد ماجد ہی کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے، ملا صاحب نے اس اکلوتے فرزند کو بڑے لاڈ پیار سے پالا، اور جب وہ چار سال چار مہینے کے ہوئے، تو اُن کی بسم اللہ کی تقریب بھی ملا صاحب نے کی، ایک قلمی تحریر کے مطابق جو مُلا عبد اللہ امیٹھوی (شاگرد رشید ملا نظام الدین فرنگی محلی) کے پوتے کی لکھی ہے، اس تقریب کا مختصر حال یہ ہے:-

والدم (یعنی پسر کلاں ملا عبد اللہ
امیٹھوی موسوم بہ مولوی شاہ علاء اللہ
احمد قلندر قدس سرہ) بیان می فرمودند
کہ در زمانیکہ تقریب مکتب یعنی بسم اللہ
حضرت ملک العلماء مولانا عبد العلی
صاحب قدس سرہ، منعقد شد در آں
محفل اجلۂ علمائے نامدار و فضلائے
والا تبار و مشائخ کبار از آں جملہ
جناب حضرت قاضی محمد تقی صاحب
ہونوی قدس سرہ، نیز موجود بودند
حسب تجویز و ایمار جملہ اصحاب محفل
حضرت قاضی محمد تقی صاحب قدس
سرہٗ بسم اللہ از زبان خود حضرت
مولانا عبد العلی صاحب قدس سرہٗ

میرے والد بیان فرماتے تھے کہ جب
ملک العلماء مولانا عبد العلی صاحب قدس
سرہٗ (بحر العلوم) کی بسم اللہ کی تقریب
منعقد ہوئی تو اس محفل میں بڑے بڑے
علمائے وقت فضلائے زمانہ اور مشائخ
کبار موجود تھے، ان ہی میں حضرت
قاضی محمد تقی صاحب ہونوی قدس
سرہ بھی تشریف رکھتے تھے، تمام حاضرین
محفل کی تجویز اور خواہش پر حضرت
قاضی محمد تقی صاحب قدس سرہٗ نے
اپنی زبان سے مولانا عبد العلی صاحب
سے بسم اللہ کہلوائی، اس سے قاضی
محمد تقی صاحب قدس سرہٗ کی زبان
کی برکت کی تاثیر ملاحظہ کرنا چاہیے،

در تبحر انواع علوم و فضائل کمالات صوری و معنوی فخر تمام علماء و اولیا کل ہندوستان شد،

کہ فرشتہ صفات حضرت مولانا عبدالعلی صاحب قدس سرہٗ کی ذات تمام علوم میں کیسی تبحر اور ظاہری و باطنی کمالات و فضائل کی کیسی جامع گذری ہے کہ ہندوستان بھر کے تمام علماء اور اولیا اللہ کے لئے باعثِ فخر ہے،

ملا صاحب کا دوسرا نکاح، جو شیخ محمد کریم بن شیخ محمد علیم بن ملا شاہ محمد ولی محمد عثمان چشتی کی دختر سے ہوا، کب ہوا، اس کا تعین مشکل ہے، "در اواخر عمر" سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے قرائن سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۱۴۱ھ و ۱۱۴۰ھ کے قریب ہوا ہوگا، اس لئے کہ ملا صاحب نے یہ عقد اپنے پیر بھائی اور صاحبِ فیضِ روحانی میر سید اسماعیل بلگرامی (وفات ۱۱۶۴ھ) کے مکاشفے کے مطابق کیا تھا. ظاہر ہے کہ ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید السادات سید شاہ عبدالرزاق بانسوی قدس سرہٗ اس وقت پردہ فرما چکے تھے، (وفات ۱۱۳۶ھ) ورنہ ان ہی سے اس سلسلہ میں رجوع کرنا اولیٰ و انسب ہوتا، ان کے خلیفہ اور پیر بھائی کا بیچ نہ ہوتا، اس کے علاوہ صاحبزادہ ملا عبدالعلی بحرالعلوم کی عمر ملا صاحب کی وفات کے وقت اٹھارہ سال کی تھی، اور صاحبزادی کی تیرہ سال کی،

در عمر ہفدہ سالگی از تحصیل علوم ظاہری فراغت یافت و در ہماں سال مولانا در قصبہ کاکوری کتخدا کرد و خود بعد شش ماہ در

ملا عبدالعلی (بحرالعلوم) سترہ سال کی عمر میں تحصیل علوم ظاہری سے فارغ ہوگئے، اور اسی سال ملا نظام الدین نے بیٹے کا عقد قصبۂ کاکوری (ضلع

ہمیں سال بعالم علوی پیوست دختر سیزدہ سالہ ناکتخدا گذاشتہ،

لکھنؤ) میں کر دیا، بیٹے کے نکاح کے چھ ماہ بعد ملا نظام الدین نے سفر آخرت اختیار فرمایا، اور ۱۳ سالہ ناکتخدا بیٹی چھوڑی،

ملا صاحب کا سالِ وفات ۱۱۶۱ھ ہے، اس وقت صاحبزادے (بحرالعلوم) اٹھارہ سال کے تھے اس سے دو ہی ایک سال قبل ملا صاحب کا عقد ثانی ہونا چاہیے، (۱۱۳۰ھ یا ۱۱۴۱ھ میں) زیادہ سے زیادہ ۱۱۳۶ھ یعنی پیر و مرشد کے وصال کے ۴ سال کے بعد تک دوسرے نکاح کا زمانہ جا سکتا ہے،

ملا صاحب کی صاحبزادی کا عقد سہالی میں ملا صاحب کے بھانجے شیخ حفیظ ابن شیخ سیف الدین کے ساتھ ہوا، جو صاحبِ اولاد ہوئیں، صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کی طرف ملا صاحب نے بذاتِ خود توجہ فرمائی، اگرچہ ملا صاحب کے تلامذہ جن میں بھتیجے اور متبنّی بھی شامل تھے، صاحب درس و تدریس ہو چکے تھے لیکن ملا صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خود ہی تعلیم دی، ہمہ وقت اس کے متمنی رہے، کہ ان کا اکلوتا بیٹا، خلف الصدق ثابت ہو، خود ہی بیٹے کو پڑھاتے بھی تھے اور ملاقات کے لئے آنے والے اللہ والوں سے بیٹے کے لئے دعا کے طلب گار بھی ہوا کرتے تھے،

ملا ولی اللہ فرنگی محلی جنھوں نے فرزند ملا نظام الدین کا کافی زمانہ پایا تھا، اپنی تصنیف عمدۃ الوسائل للنجاۃ میں جو ملا صاحب کے فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم کی حیات میں لکھی گئی تھی، لکھتے ہیں :-

اکثر معتبرین از زین نقیر زبان صاحبزادہ والا

اکثر لوگوں نے جو معتبر اور ثقہ ہیں صاحبزادہ

ملا عبد العلی سلمہ ربہ نقل کردہ اند کہ ایشاں
می گفتند مولانا علیہ الرحمۃ بحدے محبت
کہ با من داشت ہمیشہ برائے من دعائے
علم کردے و با ہر کہ از اہل اللہ
ملاقی گشتے از وے درخواست دعائے
برائے من کردے، چنانکہ روزے مولانا
علیہ الرحمۃ بگوشہ مسجد نشستہ مرا درس
می دادند، کہ دریں ہنگام دو جوان
خوب تر در مسجد در آمدند و بہ مولانا
علیہ الرحمۃ سلام گذاردند یکے از آنہا
بجانب راست و دوم، از آنہا بجانب
چپ بنشستند و مولانا علیہ الرحمۃ
بغایت تکریم و تعظیم شاں کرد، ہمہ
حیراں گشتیم کہ ایشاں کدام کسانند کہ
جناب مولانا علیہ الرحمۃ چنداں بہ تکریم
شاں کوشید، بعد ساعتے اشارہ بہ من
کردہ پرسیدند ایں کیست مولانا علیہ الرحمۃ
فرمود، پسر من برائے این دعا کنید
حق تعالی او را علم نافع و فہم کامل عطا

ملا نظام الدین، ملا عبد العلی سلمہ ربہ کی
زبانی مجھ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے،
کہ ملا عبد العلی فرماتے تھے کہ ملا صاحب
جیسی محبت مجھ سے فرماتے تھے، اس
کی بنا پر ہمیشہ میرے لئے حصول علم
کی دعا، فرمایا کرتے تھے، اور اہل
اللہ میں سے جس سے بھی ملاقات
ہوتی، اس سے بھی میرے لئے دعا
کراتے تھے، ایک دفعہ ایسا ہوا
کہ ملا صاحب مسجد کے ایک کونے میں
بیٹھے مجھے پڑھا رہے تھے، ناگاہ دو
خوبصورت جوان مسجد میں داخل ہوئے
اور ملا صاحب کو سلام کیا، ان میں
سے ایک ملا صاحب کی داہنی طرف
اور دوسرا بائیں طرف بیٹھ گیا، ملا
صاحب نے ان دونوں کی بے حد تعظیم
کی، ہم حیران تھے کہ آخر یہ کون
لوگ ہیں، جن کی اس قدر تعظیم ملا صاحب
کر رہے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد ان

فرماید، با ہم بعجب نگریستند، و گفتند
شما خود دعا درآید برانکہ اگر خواہید
بفضل الٰہی ہمیں وقت تمامی علوم
وے حاصل کردند، گفت آرے
ممکن ست، از لطف الٰہی، لاکن
مقصود من حصول علم بدیں طور
نیست می خواہم کہ نور دیدۂ من
بکسب و اکتساب میسر شوند، ایں
بگفت و دست بدعا برداشت و آں
ہر دو کساں شریک دعا بودند ہرگاہ
از دعا فارغ شد آنہا از نظر با غائب
شدند عجب بر عجب مرا افزود، پرسیدم
کہ ایں ہا کدام کس بودند فرمودند
از جملہ اولیائے کرام در فلاں جزیرہ
مشغول بحق داشتند،

نوواردوں نے میری طرف اشارہ کرکے
پوچھا یہ کون صاحبزادے ہیں؟ ملا صاحب
نے فرمایا میرا بیٹا ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالی
اسے علم نافع اور فہم کامل عطا فرمائے
ان نوواردوں نے باہم ایک دوسرے کو
پہلے تو تعجب سے دیکھا پھر بولے آپ کو
خود یہ قدرت حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو
ابھی تمام علوم بفضل الٰہی صاحبزادے
کو حاصل ہو جائیں، ملا صاحب نے
فرمایا کہ اللہ تعالی کے لطف و کرم
سے بے شک یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن
میرا مطلب اس طرح حصول علم سے
نہیں ہے، یہ چاہتا ہوں کہ میرے
نور نظر کو پڑھ کر اور کسب کے ذریعہ علم
نصیب ہو، اتنا فرمانے کے بعد ملا
صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور
ان دونوں نوواردوں نے بھی دعا میں
شرکت و اعانت کی، جوں ہی ملا صاحب
دعا سے فارغ ہوگئے، یہ دونوں اپنے

ہماری نظروں سے غائب ہوگئے،
مجھے حیرت پر حیرت ہوئی بالآخر میں
نے ملا صاحب سے دریافت کیا کہ
یہ کون لوگ تھے،؟ فرمایا اولیائے
کبار میں سے تھے، فلاں جزیرے میں
یادِ الٰہی میں بسر کرتے ہیں،

ملا عبدالعلی (بحر العلوم) نے اپنے والد ماجد ہی سے تعلیم پائی، اور فارغ التحصیل ہوگئے، اس وقت اُن کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی، اکلوتے بیٹے تھے، فارغ التحصیل ہونے کے باوجود درس تدریس کی طرف توجہ نہیں کی، والد ماجد نے اس کے بعد شادی بھی کردی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے بعد بھی ملا عبدالعلی نے خاندان کی ذمہ داریوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اُن کی شادی کے چھ ماہ بعد ہی ملا صاحب کا انتقال ہوگیا، اب گھر کی ساری ذمہ داری، اُن ہی پر آپڑی، پھر بھی والد ماجد کی قائم مقامی کی طرف اُن کا دھیان نہیں گیا، دھیان کب گیا جب تابڑ توڑ دو واقعے پیش آئے، ایک واقعہ تو شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے پر جلسہ دستار بندی کے موقع پر پیش آیا جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، دوسرا واقعہ جو اس سے قبل کا معلوم ہوتا ہے روایتاً ہم تک پہونچا ہے، وہ یہ کہ ملا صاحب کے وصال کے بعد ایک فقیر صدا لگاتا ہوا دروازے پر آیا، گھر سے ماما نے نکل کر اس کو کچھ دینا چاہا، فقیر نے نہیں لیا اور ملا صاحب سے ملنے کی خواہش کی، ماما نے جواب دیا کہ ملا صاحب پردہ فرما چکے ہیں، فقیر نے کہا ان ملا صاحب سے نہیں اُن کے بیٹے ملا صاحب کو میں کہہ رہا ہوں، ماما نے اندر آکر ملا عبدالعلی سے کہا کہ باہر کوئی آپ کو پوچھ رہا ہے، نوجوان ملا عبدالعلی چھت پر کبوتر اڑا رہے

تھے، اسی حالت میں باہر آگئے، ایک کبوتر بھی ہاتھ میں تھا، فقیر نے کہا آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ کبوتر اڑائیں، ملا عبدالعلی نے ہاتھ سے کبوتر اڑا دیا، یہ واقعہ مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی (خفید ملا عبدالعلی بحر العلوم) نے بیان کیا،

غالباً اس واقعہ کے بعد ٹیلے والا واقعہ ہوا کہ جلسہ دستار بندی میں بٹیروں کی کابک ہاتھ میں لئے ملا عبدالعلی جلسہ گاہ پہونچے اور مجمع نے جب اندر جانے میں مزاحمت کی، تو انھوں نے بتایا کہ میں ملا نظام الدین استاذ الہند کا بیٹا ہوں، کسی نے جواب دیا کہ استاذ الہند کے بیٹے ہوتے تو اُن کی جگہ صدر میں بیٹھے ہوتے یا اس طرح یہاں دھکے کھاتے ہوتے، جملہ پوری طرح کارگر ثابت ہوا، اور ملا عبدالعلی کبوتر اور بٹیر کے مشغلوں سے تائب ہوکر والد ماجد کے مزار مبارک پر جاکر خوب روئے اور علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے، والد ماجد کے نامور تلمیذ ملا کمال الدین سہالوی سے بھی رجوع کرتے رہے، جس کے نتیجے میں فرنگی محل میں والد ماجد کے اجلہ تلامذہ کے سلسلۂ درس و تدریس کے باوجود مرجع انام ہوگئے، یہاں تک کہ جب ایک ناگوار واقعہ پیش آیا تو حکومت وقت کے مقابلے میں ملا عبدالعلی بحر العلوم کے گرد اتنی جمعیت اکٹھا ہوگئی تھی کہ حکومت وقت کو مزید کارروائی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہونا پڑا،

واقعہ اگرچہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا، لیکن اُس نے چشم زدن میں شیعہ سُنی رنگ اختیار کرلیا، جس کی تفصیل ملا عبدالاعلیٰ (فرزند اکبر ملا عبدالعلی بحر العلوم) نے رسالہ قطبیہ میں اس طرح بیان کی ہے،

سید نور الحسن بلگرامی در زمانۂ سابق
مذہب اہل تشیع می داشت، در حویلی
مولوی محب اللہ استقامت ورزیدہ

سید نور الحسن بلگرامی جو اس وقت شیعہ
مذہب رکھتے تھے (فرنگی محل کے اندر
اپنے دوست) مولوی محب اللہ (ابن

بود، جہت بیماری طاقت رفتن برائے زیارت روضہ نداشتند، دراں حویلی طلب نمود، چونکہ مدرسہ مولانا کامل در اثنائے راہ بود و آں وقت فاتحہ بر شربت کہ نذر امامین بود می کردند روضہ را دیدند و تکلم کردن نتوانستند از دست اشارہ کردند کہ برندگان را منع کنید کہ ایں طرف راہ نیست کہ می برند شاہ راہ فراموش کردہ باشند بعضے طلبائے متعصبین فہمیدند کہ ایں بدعت را اشارہ شکستن کردہ اند یک بارگی شکستند، چوں مولانا کامل از فاتحہ فارغ شدند طلبا را بسیار غصہ فرمودند......

ملا عبد الحق بن ملا سعید) کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، چونکہ بیماری کی وجہ سے وہ تعزیہ کی زیارت کو جا نہیں سکتے تھے، (اور یہ زمانہ محرم کا تھا، غالباً عشرے کا روز ہوگا) تعزیہ کو (جو فرنگی محل کی گلی سے جلوس کے ساتھ گذر رہا تھا، فرنگی محل کے پھاٹک کے اندر) بلوا کر اپنی قیام گاہ سے اس کی زیارت کرنا چاہی، اُن کی قیام گاہ یعنی مولوی محب اللہ کے مکان تک جانے میں ملا بحر العلوم کا مدرسہ بیچ میں پڑتا تھا، اور اس وقت بحر العلوم حضرات حسنینؓ کی نذر کے شربت پر فاتحہ دے رہے تھے، انھوں نے تعزیہ آتے دیکھا تو فاتحہ میں معروف ہونے کی وجہ سے بول نہ سکے، ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ تعزیہ لانے والوں کو روکو، اس طرف راستہ

نہیں ہے، شاید بھولے سے ادھر نکل آئے ہیں بعض متعصب طلبا یہ سمجھے کہ بحر العلوم نے ہاتھ سے جو اشارہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعزیہ توڑ ڈالا جائے، اچانک وہ تعزیہ پر ٹوٹ پڑے، اور اُسے توڑ ڈالا، بحر العلوم جب فاتحہ دے چکے، تو طلبا پر بے حد غصہ فرمایا،

مگر واقعہ تو پیش آچکا تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ عملداری ہو چکی تھی، شجاع الدولہ کا زمانہ تھا یعنی اس وقت تک لکھنؤ اودھ کی راجدھانی نہیں بنا تھا، بہرحال اس واقعہ سے شیعوں میں ہلچل مچ گئی اور یہ شہرت ہوگئی کہ

مولانا از امامین منحرف شدہ متوجہ سوئے خروج شدند بہیں دستاویز قاضی غلام مصطفےٰ کہ مقتدائے اہل تشیع بودند و از مولانا کامل معاندت دینی و دنیوی می داشت بلوہ عام نمودہ خواست کہ مولانا کامل را تصدیعہ دہد ایں خبر بمولانا کامل رسید، مولانا کامل نیز بلوہ خاص

مولانا بحر العلوم حضرات حسنینؓ سے منکر ہو کر بغاوت پر آمادہ ہوگئے ہیں، شیعیان لکھنؤ کے قاضی غلام مصطفےٰ لیڈر تھے، انھوں نے اس کو بہانا بنا کر، اس لئے کہ وہ بحر العلوم سے دین و دنیا کی عداوت جمع کیا، اور بلوہ کرکے مولانا بحر العلوم کو زک پہنچانا چاہی، بحر العلوم کو جب اس

عام نمودہ ارادہ محاربہ نمودہ

کی خبر گئی تو انھوں نے بھی (اہلِ سنّت کے) عوام اور خواص کو اکٹھا کرکے ارادہ کرلیا کہ حملہ آور سے جنگ کریں گے،

"خاص و عوام" کی اتنی بڑی فوج جمع کرلینا اسی وقت ممکن ہے، جب ان کا علمی اقتدار معاشرے میں پوری طرح سرایت کرچکا ہو، اتنی بڑی جمعیت بحرالعلوم کے گرد اکٹھا ہوگئی تھی کہ حکومت وقت اور شیعہ لیڈر قاضی غلام مصطفیٰ :-

تاب مقاومت نیاوردہ پیام صلح نمودند، مولانا کامل صلح فیما بین اسلام اصلح دیدند قبول کردند،

مقابلہ کی طاقت نہ پاکر صلح کے پیغام دینے لگے بحرالعلوم نے مسلمانوں کے درمیان صلح ہوجانے کو مناسب سمجھا اور پیغام صلح قبول کرلیا،

مگر بحرالعلوم تک خبریں آنے لگیں کہ یہ صلح محض فریب ہے، مقصد یہ ہے کہ غفلت میں موقع پاکر بحرالعلوم کو قتل کردیا جائے، بحرالعلوم نے عزیزوں اور دوستوں سے صلاح لی کہ کیا کرنا چاہئے، ہر وقت اپنی محافظت کا انتظام رکھنا قدرت سے باہر ہے، اعزہ نے جواب میں مشورہ دیا کہ:-

اصلح آنست کہ چندے سفر نمایند چوں مقدمہ کہنہ شود باز بیایند و آشنایاں جواب دادند کہ مکان مولانا غارت گذاشتن خوب نیست بہ متفق شدہ تدارک این معنی خواہیم نمود،

بہتر یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لئے یہاں سے کہیں چلے جائیں، جب معاملہ پرانا ہوجائے پھر تشریف لے آئیں، دوستوں اور مخلصوں نے کہا، ملا نظام الدین کا آستانہ چھوڑنا مناسب نہیں ہے، ہم لوگ متحد و متفق ہوکر اس صورت حال کا مقابلہ کریں گے،

بحرالعلوم نے اعزہ کے جواب سے بددل ہوکر مخلصوں سے کہا کہ ہمارے اعزا جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں، تیار نہیں معلوم ہوتے، تو تم کیا کرپاؤگے، پھر یہی طے فرمایا کہ لکھنؤ سے چلے جائیں، چونکہ یہ خیال تھا کہ مخلصین جانے سے روکیں نہ کہیں، اس لئے بلا اطلاع دیئے اور بہانے سے لکھنؤ چھوڑ کر شاہجہان پور، حافظ رحمت خان والی ملک روہیل کے پاس چلے گئے،

رسالہ قطبیہ کے مصنف کے اس قول سے کہ بے اطلاع بحیلہ بسیار مولانا بہجرت تمام ہجرت نمودہ" بحرالعلوم کے ایک شاگرد کے اس قول کا مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ "جب مولانا بحرالعلوم حج وزیارت کے لئے روانہ ہوگئے، تو" یہ بات "عقیدۂ دقیقہ" (قلمی) کے مصنف نے مقدمے میں لکھی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لکھنؤ سے روانہ ہونے کے لئے مولانا بحرالعلوم نے حج وزیارت کے لئے روانگی کا خیال ظاہر کیا ہوگا جس سے عقیدۂ دقیقہ کے مصنف کو غلط فہمی ہوگئی، حالانکہ بحرالعلوم کو ہندوستان سے باہر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا،

یہ ناخوش گوار معاملہ تخمیناً ۱۱۷۲ھ میں یعنی استاذ الہند ملا نظام الدین کی وفات کے دس گیارہ برس بعد پیش آیا، ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے اغصان اربعہ (مطبوعہ) میں اس واقعہ کا اشارۃً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "درا وائل حال او را سانحہ عظیمہ در وطن پیش آمد" اسی کے ساتھ انھوں نے عزیزوں کے جواب کی وضاحت بھی کی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ "میرے والد اور میرے چچا نے مجھ کو بتایا کہ "اس سانحہ کے بعد بحرالعلوم سے اور میرے دادا ملا محب اللہ" سے گفتگو ہوئی تھی، اور انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ ہم لوگ (عزیز اور رشتہ دار) تو گھروں میں رہتے ہیں، آپ کے پاس طالب علم بڑی تعداد میں ہیں، جو شہر میں سیر و تفریح کے لئے بھی جایا کرتے ہیں، اور آپ ان طالب علموں کو عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ مانتے ہیں، اگر شہر کے اوباشوں اور بدمعاشوں نے شہر میں کہیں آپ کے ساتھ یا آپ کے طلبہ کے ساتھ کوئی گستاخی کی، یا

جان لے لی تو ہم لوگ وہاں کہاں موجود ہوں گے؟ ہاں اگر ایسا ہوا کہ آپ کے گھر پر کوئی بری نیت سے آیا اور فساد کرنا چاہا، تو پہلے ہم اپنا سر آپ پر تصدق کریں گے، اس کے بعد جو ہوگا ہوگا، بحر العلوم نے فرمایا کہ محض اس حد تک ذمہ داری قبول کرنے سے میرا یہاں قیام ممکن نہیں ہے، میرے دادا ملا محب اللہ نے ہمہ وقت کی ذمہ داری (شرکت عمومی) لینے کی جرأت نہیں کی، اور بحر العلوم نے شہر کے گڑبڑ کا اندازہ کرتے ہوئے ترکِ وطن کر لیا،" (اغصان اربعہ ص ۱۲۲، کا خلاصہ)

بحر العلوم کا یہ مزاج کہ وہ حکومت وقت سے مقابلہ تک کے لئے تیار ہو گئے، اپنے والد ماجد ملا نظام الدین کے غم خور مزاج کے برعکس تھا، ملا صاحب نے پوری زندگی فروتنی اور غم خوری میں گذار دی، اس قدر بردباری اور حلم اُن کے مزاج میں تھا کہ متعلقات فرنگی محل میں آباد کرایہ داروں تک سے حق و استحقاق کے معاملے میں بھی سختی کا رویہ برتنے سے انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ برادر زادے ملا احمد عبد الحق نے رعایا کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی سرکشی کا انسداد کیا،

رعایا اور کرایہ دار کا معاملہ تو ایک طرف ملا نظام الدین اپنے ہم چشموں اور معاصروں کے علمی اعتراضات تک پر سکوت اختیار کرتے تھے، خواہ اس میں خود ملا صاحب کی کتنی ہی سبکی کیوں نہ ہو جائے فرماتے تھے کہ

اگر اعتبار ور شد کسے در الزام من	مجھے غلطی پر قرار دے کر اگر کسی کا اعتبار
باشد مارا قبولش است.	اور مرتبہ علمی بڑھتا ہے تو میں غلطی قبول
	کرنے پر تیار ہوں،

فرماتے ہی نہیں تھے، بلکہ اس پر ایسا عامل تھے کہ اس کے برعکس ہونے پر بے حد ناراضگی ہو جاتی تھی، اس سلسلے میں ایک واقعہ ہو بھی گیا تھا، ایک صاحب علم نے ایک معقول مسئلے کے سلسلے میں ملا صاحب سے استفسار کیا، ملا صاحب نے اس کا مناسب جواب بھی دے دیا، اس صاحب علم نے ایسی بحث و تکرار شروع کر دی

جس کا مقصد مقابل کو خاموش کر دینا ہوا کرتا ہے، ملا صاحب نے اس خیال کے پیش نظر کہ فضول بحث مباحثہ اہل علم کی شان کے خلاف ہے، خاموشی اختیار کر لی، بحث کرنے والے صاحب ملا صاحب کے پاس سے گئے، اور سب جگہ مشہور کر دیا کہ میں نے ملا صاحب کو بحث میں چپ کر دیا، شدہ شدہ یہ بات ملا صاحب کے تلامذہ تک پہنچی، مسئلہ زیر بحث پر خود ملا صاحب اپنی بعض تصنیفات میں مفصل روشنی ڈال چکے تھے، بحث کرنے والے صاحب نے جو بات چھیڑی تھی، اس کے جواب ملا صاحب کی تصنیف میں لکھے موجود تھے، ملا صاحب کے طلبہ کو جب معلوم ہوا، تو ان میں سے ایک صاحب بحث کرنے والے اہل علم کی خدمت میں پہونچے، اور اسی مسئلے میں ان سے بھڑ گئے، یہاں تک کہ اس کو خاموش کر دیا اور یہ بھی جتا دیا، کہ ملا صاحب جو بحث میں خاموش ہو گئے تھے، تو محض اسلئے کہ فضول کی تکرار ان کا شیوہ نہیں، حالانکہ مسئلہ زیر بحث کے بارے میں ملا صاحب اپنی تصنیف میں یہ سب لکھ چکے ہیں، طالب علم نے تو حق شاگردی ادا کر دیا، اور صحیح ادا کیا، لیکن ملا صاحب کو جب اس کی خبر لگی تو

ازاں طالب علم بسیار ناخوش و ملول	اس طالب علم سے بے حد ناخوش اور
خاطر گشت و گفت اگر مرداں بطریق	رنجیدہ ہو گئے اور طالب علم سے فرمایا
طعن چیزے می گفتند مرا می گفتند نہ	کہ اگر لوگ بطور طنز کچھ کہتے ہیں تو مجھ
ترا، اگر در الزام من اعتبار فاضلے گردد،	کو کہتے ہیں تم کو نہیں کہتے ہیں، اگر مجھے
اولیٰ است از آنکہ بسبب من بربادی	کم علم قرار دینے سے کسی عالم کا اعتبار
و حرج درس فاضلے شود،	زیادہ ہوتا ہے، تو یہ بہ نسبت اس کے
	بہتر ہے کہ میری وجہ سے کسی صاحب
	درس فاضل کے درس میں خلل پڑے
	اور بربادی ہو،

صرف اسی تلقین و نصیحت پر بس نہیں کی، بلکہ :-

اورا از خانۂ خود وداع کرد و گفت
کہ من بایں قسم کارہا راضی نشوم و
بایذاے احدے ارتکاب نکنم،
(عمدۃ الوسائل قلمی)

اس طالب علم کو اپنے یہاں سے خارج
کردیا، اور کہہ دیا کہ اس قسم کی حرکتوں
سے میں راضی نہیں ہو سکتا، کسی شخص
کو بھی رنج پہنچانے کے جرم کا ارتکاب
نہیں کرتا ہوں،

اس خاکساری اور فروتنی کا مطلب یہ نہیں کہ علم اور دین کے حقوق کی نگہداشت سے بھی چشم پوشی فرما جاتے تھے، اس کے برعکس اہلِ ثروت اور دنیاوی اقتدار رکھنے والوں سے زیادہ التفات نہ فرماتے، اور اگر ایسے لوگوں سے کوئی حاضرِ خدمت ہوتا تو اس کی تعظیم کے لئے کبھی کھڑے نہ ہوتے، بلکہ فرماتے تھے کہ :-

ایں ہمہ از روے ریاست

اہلِ ثروت کی اس طرح تعظیم کرنا
دکھاوے میں داخل ہے،

اس سلسلے میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے :-

میاں شیخ غلام مخدوم ساکن سہالی
کہ بابائی خدمت اخلاص و نیاز وافرے
داشتند ازیں خاکسار حکایت می کردند
کہ من در ایام شباب خود بیمار شدم
در مکانے کہ مولانا می نشست بر سریرے
ازیں سبب افتادہ می ماندم روزے

میاں شیخ غلام مخدوم ساکن سہالی
نے جو ملا صاحب سے عقیدت بھی
رکھتے ہیں، اور رشتہ داری بھی، مجھ
سے بیان کیا کہ میں جوانی کے زمانے
میں بیمار ہو گیا تھا اور اس مکان
میں جو ملا صاحب کی نشست گاہ تھی

بعضے از امیران صاحبِ جاہ براے
ملازمت شان آمدند، دانستم کہ ایں
وقت بالانشینی مناسب نیست خواستم
کہ از تخت فرود آیم و بزیر نشینم فرمودند
اے فلاں بحال خود باش و دیدن
سفید پوشاں دیوانہ مگرد،

ایک تخت پر پڑا رہتا تھا، ایک روز
کوئی صاحبِ عزت و اقتدار امیر ملا
صاحب سے نیاز حاصل کرنے آیا،
میں نے خیال کیا اس وقت مجھ
کو تخت پر بیٹھے رہنا زیبا نہیں ہے،
میں تخت سے اتر کر نیچے فرش پر (جہاں
ملا صاحب اور صاحبِ اقتدار ملاقاتی
بیٹھے تھے،) بیٹھنے کا ارادہ کیا، ملا
صاحب نے فرمایا، غلام مخدوم اپنی
جگہ بیٹھے رہو، سفید پوشوں (رئیسوں)
کو دیکھ کر دیوانے نہ ہو جاؤ،

ہفت ہزاری منصب رکھنے والے ایک امیر نے جو ملا صاحب سے بھی تلمذ رکھتے تھے، اور عقیدت بھی، جمعہ کی نماز کے لئے ایک دفعہ کہلوا بھیجا کہ :-

انتظار من اگر حضرت فرمایند من ہم
داخل جماعت گردم، و باقتداے
آنحضرت نماز گذارم،

اگر تھوڑا سا انتظار فرمالیں تو میں
بھی جماعت میں شامل ہو کر حضور
والا کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت
حاصل کروں،

ان ہفت ہزاری منصب والے شاگرد اور عقیدت مند کو آنے میں وقتِ مقررہ سے کچھ تاخیر ہو گئی، ملا صاحب نے بغیر ان کی انتظار کئے نماز پڑھا دی، اور فرمایا:-

نماز خدا است نہ اہل دنیا و انتظار
چنیں کساں داخل ریا است،
(عمدۃ الوسائل)

نماز خدا کی ہے، دنیا والوں کی نہیں ہے
اور ایسے لوگوں کا نماز میں انتظار
کرنا دکھاوے میں داخل ہے،

لباس اور رہن سہن میں بھی مُلّا صاحب کے یہاں کوئی امتیاز اور شناخت والی بات نہ تھی، عام انسانوں کی طرح لوگوں میں بیٹھتے تھے، اجنبی پہچان بھی نہیں سکتا تھا، کہ اس مجمع میں ملا صاحب کون ہیں:-

ابو المعالی خاں برائے ملاقات آمدہ
از مردماں پرسید کہ ملا نظام الدین کجا ست
مردم مکان نشست مولانا قدس سرہٗ نشان
دادند در آں وقت جناب شاہ بزمین
فرش ناکارہ نشستہ درس می دادند و
چونکہ کرو فر علمائے ولایت دیدہ بود ایشاں
را چوں بریں حالت دید نشناخت و دانست
کدام فاضلے است کہ درس می دہد گفت
مولانا نظام الدین بکدام جا می نشینند و
درس می دہد، فرمود من نمیدانم کہ مولانا
کجا ست نظام الدین نام من است،

ابو المعالی خاں ملاقات کیلئے آئے لوگوں
سے پوچھا کہ ملا نظام الدین کہاں ہیں؟
لوگوں نے وہ جگہ بتا دی جہاں ملا صاحب
بیٹھا کرتے تھے، ابو المعالی وہاں گیا،
اس وقت مُلّا صاحب زمین پر بچھے ایک
پھٹے پرانے کپڑے پر بیٹھے ہوئے تھے اور
سبق پڑھا رہے تھے، ابو المعالی ملائے
فارس کی شان و شوکت دیکھے ہوئے
تھا، ملا صاحب کو جو اس بے سر و سامانی کے
عالم میں درس دیتے پایا تو پہچان نہ سکا سمجھا کہ کوئی
مدرس ہوں گے جو لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں اس نے
پوچھا یہ مولانا نظام الدین کس جگہ تشریف رکھتے
ہیں اور درس دیتے ہیں ملا صاحب نے فرمایا کہ

(باقی)

کلیلہ و دمنہ کے سنسکرت مآخذ
اور
اس کے فارسی تراجم

از
جناب شرف عالم صاحب ایم اے ریسرچ اسکالر

ہندوستان عہد قدیم سے علوم و فنون اور معرفت و حکمت کا گہوارہ رہا ہے، عرب مصنفین بھی ہندوستان کو حکمت کی جنم بھومی تصور کرتے تھے، یہاں کے علوم و عرفان کی روشنی دور دراز ممالک تک پہنچی، چین، جاپان، برما اور سیام سے تشنگانِ علم طویل اور دشوار مسافتیں طے کر کے ہندوستان آتے تھے، اور فلسفہ و ریاضی اور طب و نجوم وغیرہ علم سے بصیرت افروز ہو کر اپنے وطن واپس جاتے تھے، برہمنوں کی تصنیفات علم و دانش کا خزانہ ہوتی تھیں، قدیم ہندوستان کی اہم ادبی کتابوں میں سنسکرت کی وہ تصنیف بھی قابل ذکر ہے جس کی بنیاد پر کلیلہ و دمنہ عالم وجود میں آئی۔ اس کے ابتدائی پس منظر کا ذکر اگرچہ روایت پر مبنی ہے، پھر بھی دلچسپی سے خالی نہیں

مقدمہ انوار سہیلی[1] میں مذکور ہے کہ ایک بادشاہ چین نے اپنے وزیر سے سنا کہ ہندوستان کے ایک خطہ کے حکمراں داب شلیم نے جس کی راجدھانی سومنات ہے، ایک شب خواب میں دیکھا کہ ایک خاص پہاڑ کے دامن میں جواہرات کا خزانہ دفن ہے، چنانچہ جب اس کی کھدائی ہوئی تو بہت سے صندوقوں کے ساتھ ایک مرصع صندوق برآمد ہوا جس کے اندر ایک

[1] انوار سہیلی ص ۳-۴ مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۳۰۶ھ

بکس تھا۔ اس میں ایک ڈبیہ کے اندر سفید حریر کے ٹکڑے پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک زاویہ نشین نے جو جملہ علوم و فنون میں دستگاہ رکھتا تھا۔ دابشلیم کو بتایا کہ اس ٹکڑے پر سریانی زبان میں ہوشنگ کا نسب نامہ (ہوشنگ بن سیامک بن گیومرث بن سام بن نوحؑ) مرقوم ہے، اور چودہ نصیحتیں درج ہیں، دابشلیم نے غور کیا کہ اکثر متواتر پند و موعظت سامعین پر گراں گذرتی ہے، اور انسانی فطرت افسانے سننے کی زیادہ مشتاق رہتی ہے، اس لیے دابشلیم نے ایک حکیم روشن رائے بیدپا نامی برہمن سے سنسکرت میں ایک کتاب تصنیف کرائی جس کا نام کرتک و دمنک رکھا۔

ابوریحان البیرونی اپنی کتاب تحقیق ما للہند میں رقم طراز ہے کہ ہندوؤں کی کتاب پنچ تنتر (Panchtantra) سے عرب و عجم کی کلیلہ و دمنہ ماخوذ ہے۔[1] تنتر (Tantra) سے مراد وہ دینی مضامین ہیں جن میں مذہب کے اخلاقی، تہذیبی اور عباداتی اصولوں کی وضاحت عقل و عرفان کی روشنی میں کی جائے۔ وید کے احکام عوام الناس کے لیے عملی طور پر سخت اور دشوار تھے، اور سماج کا ہر طبقہ وید کے اوامر و نواہی کی انجام دہی کا اہل نہ تھا۔ اس دشواری کے پیش نظر ویدی علماء نے تنتر مرتب کیں، جس سے ان احکام پر عمل نسبتاً آسان ہو گیا، کیتھ (A.B. Keith) نے تنتر کو موضوع یا subject mathm کے معنی میں لیا ہے،[2] پنچ تنتر میں پانچ موضوعات پر تمثیلیں ہیں، جو وحوش و طیور کی زبانی بیان ہوئی ہیں، کرتکا، دمنکا اس کتاب کے دو اہم کردار ہیں، یہ دونوں (کرتکا اور دمنکا) (Karlaka, Damanka) جنگل کے بادشاہ شیر کے وزرا شغال (Jackals) ہیں، پنچ تنتر جب ایران (جس کا ذکر آگے آئیگا) پہنچی تو کرتکا اور دمنکا کی ذہانت و ذکاوت اور اہم کردار کی بنا پر اس کتاب کا نام پہلوی زبان میں کلیلگ و دمنگ رکھا گیا، اور دری زبان میں چونکہ کلمات کے آخری[3] "گ" "ہا غیر ملفوظ" سے بدل جاتے ہیں،

[1] سبک شناسی، بہار مشہدی ج ۲ ص ۲۵۱
[2] Introduction to classical Sanskrit by G. Sastri P.44
[3] سبک شناسی، بہار مشہدی ج ۱ ص ۲۴۹

اس لیے کلیلگ و دمنگ کلیلہ و دمنہ ہو گیا۔

اصلی پنچ تنتر اب باقی نہیں ہے۔ اس کے چار متنوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، ایک پنچ تنتر شمالی و غربی کے نام سے معروف ہے، جو گناڈھیا (Gunadhya) کی برہت کتھا (Brihat Katha)، سوما دیو (Somadeua) کی کتھا سرت ساگر (Katha Sarit sagar) اور کشیمندر (Kshamendra) کی برہت کتھا منجری (Brihat Katha Manjari) کا ماخذ ہے۔

دوسرا اُرتنتر کھانیکا (Ur Tantrakhyanika) جو کشمیری تنتر کھانیکا (Tantrakhyanika) اور پنچا کھیانیکا (Panchakhynika) پانچ کھیانہ تالیف پورن بھدر (Purnabhadra) کا ماخذ ہے، اور تیسرا تین متنوں کا ماخذ بنا، ایک پنچ تنتر جنوبی ہے، جسے ہرٹل (Hertel) نے ترتیب دیا ہے، دوسرا نیپالی اور تیسرا بنگال کے ناراین پنڈت کی تالیف ہوپدیش (پندنامہ Hitopdesha) ہے، متن چہارم وہ ہے جس کا پہلوی میں ترجمہ ہوا۔[1]

پنچ تنتر کے زمانۂ تالیف کے بارہ میں کیتھ (Keith) نے ہرٹل (Hertel) کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اس کی رائے میں پنچ تنتر عیسوی صدی کے اوائل میں تصنیف ہوئی، اس لیے کہ اس میں کچھ ایسے الفاظ (کیتھ نے یہ الفاظ مثلاً لاطینی (Dinarius) کا دنارا Dynara کی شکل میں استعمال نقل کیا ہے) استعمال ہوئے ہیں جو مہابھارت کے زمانہ میں مستعمل تھے، کیتھ پنچ تنتر برہمانیسال (Brahmanical) کے عہد حکومت میں اور گپت شہنشاہ کے عہد عروج میں یا اس سے چند سال قبل تالیف ہوئی۔

[1] A History of Sanskrit Literature By A.B. Keith. P.246-247 - مقالہ ڈاکٹر تاراچند و ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ۳۴۹ در مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، شمارہ سوم

تاریخ ادبیات سنسکرت History of Sanskrit literature) کے مولف کیتھ (A. Berriedale Keith) اور کلاسیکی سنسکرت ادبیات کا تعارف (Introduction To The Classical Sanskrit Literature) کے مولف جی ساستری (G. Sastri) دونوں متفق الرائے ہیں کہ پنچ تنتر ہی کا پہلوی ترجمہ ہوا، پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوتا رہا، ان کی رائے میں اس کا پہلوی اور سریانی ترجمہ چھٹی صدی عیسوی میں اور عربی، عبرانی اور اسپینی ترجمہ بالترتیب آٹھویں، گیارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں ہوا، لیکن سعید نفیسی نے احوال و آثار و اشعار رودکی[1] میں لکھا ہے کہ یہ تمام تراجم پنچ تنتر (مولف وشنو سرمن Vicnu Sarmanh) کے نہیں، بلکہ کرتکا و دمنکا، مولفہ بیدپا برہمن یا بیل یا برہمن کے ہیں۔

اور اس کے ثبوت میں عبد اللہ ابن المقفع، فردوسی، نصر اللہ بن عبد الحمید شیرازی اور حاجی خلیفہ (مولف کشف الظنون) کے اقوال نقل کیے ہیں، کلیلہ و دمنہ کا عربی ترجمہ پہلوی کلیلہ و دمنہ کے اس نسخہ پر مبنی ہے، جسے حکیم بزرگ مہر نے ترتیب دیا تھا، زمانہ حال کی تحقیقات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بیدپا یا بیل پا کوئی شخص نہ تھا، بلکہ ایک برہمن کا لقب تھا جو حکیم برزویہ نے عطا کیا تھا۔

کلیلہ و دمنہ کے ماخذ اور اس کے مصنف کے بارہ میں مورخین میں اختلاف ہے، لیکن سنسکرت ادبیات کے مورخین اور عربی و فارسی ادبیات کے مورخین یہ دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کلیلہ و دمنہ کا ماخذ سنسکرت کی کتاب ہے، جو ایک دفتر عقل و دانش ہے جس میں پند و نصائح کی پھیکی اور بے مزہ باتوں کو لطف و تفریح کی شیرینی اور چاشنی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور طبیعتوں کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانوں کی بنیاد حقائق پر رکھی گئی ہے، اور یہ افسانے اور حکایتیں وحوش وطیور کی زبان سے ادا کیے گئے، اس کا مقصد یہ تھا کہ افسانوں اور حکایتوں

---

[1] احوال و آثار و اشعار رودکی بکوشش سعید نفیسی ص ۳۰۴

میں پوشیدہ علم و حکمت اور عقل و دانش کی باتیں انسانوں کے ذہن میں آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر منتقل ہوں، اور ان کا شعور افسانوں کے لطف سے محظوظ ہو، معلمین آسانی سے اس کا درس دے سکیں، اور متعلمین کے ذہنوں پر حکایتوں کے نقوش تا دیر قائم رہیں، اس کتاب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا کہ بادشاہ اور ارباب سیاست و مملکت بھی رعیت پروری، عدل گستری، قیام امن و راحت اور فتنہ انگیز عناصر کی زجر و توبیخ میں اس سے راہ نمائی حاصل کریں۔

حکمت عملی فرد اور جماعت دونوں کے لیے جداگانہ اہمیت رکھتی ہے، فرد کا تعلق تہذیب اخلاق سے ہے، جس کو مشرق کے مفکروں نے حکمت عملی کا ایک شعبہ قرار دیا ہے، حکمت عملی کی دوسری قسم کا تعلق جماعت سے ہے، یہ دو قسموں میں منقسم ہے، ایک جس کا تعلق خانگی زندگی سے ہے، اس کو تدبیر منزل کا نام دیا گیا، دوسری جس کا تعلق شہر و ولایت، اقلیم و مملکت کے رابطوں کی زندگی سے ہے، اس کو سیاست مدن کے نام سے موسوم کیا گیا، کلیلہ و دمنہ کا موضوع یہی سیاست مدن ہے،

حکیم بیدپا برہمن ایک حقیقت پسند اخلاقی فلسفی تھا جس نے سنسکرت میں یہ لافانی گنجینۂ حکمت ترتیب دیا، راجہ دابشلیم کو یہ کتاب زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھی، وہ اپنی پریشانیوں اور الجھنوں کا حل اسی سے ڈھونڈھتا تھا، گویا یہ کتاب جملہ مشکلات کی کنجی تھی، اس کے عہد میں یہ کتاب عوام سے پوشیدہ رہی، دابشلیم کے جانشینوں نے بھی علم و حکمت کے اس خزانہ کو اپنے سینوں میں پوشیدہ رکھا، اور اس کو عام نہیں ہونے دیا، اس کی وجہ بادشاہوں کی خود غرضی کے علاوہ عوام کی علم سے محرومی بھی تھی، اس لیے یہ کتاب مدتوں ہندوستان کے صرف چند نامور حکمرانوں تک محدود رہی، جنھوں نے ذاتی خزانہ کی طرح اسے دوسروں سے چھپائے رکھا، حسن اتفاق ہے کہ کسی طرح انوشیرواں کے زمانہ میں ایران میں متعارف ہوئی۔

انوشیروان (۵۳۱ء - ۵۷۹ء) کو ایک ہندوستانی برہمن سے معلوم ہوا کہ ایک حکیم بیدپا برہمن نے علم و معرفت اور عقل و حکمت کے نکات کتاب کی شکل میں مرتب کیے ہیں، جو کرتکا و دمنکا[1] کے نام سے معروف ہے لیکن یہ قیمتی نسخہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے، سلاطین کو رعایا کی سیاست اور قواعد حکومت میں اس سے سبق ملتا ہے، اور وہ اسے سرمایۂ موعظت و بصیرت تصور کرتے ہیں، یہ سنکر انوشیروان کو اس کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا، وہ جس قدر عدل گستری میں بے مثال تھا، اسی قدر علم و ہنر کا بھی سرپرست و مربی تھا، اس نے اپنی مملکت کے ایک نوجوان دانشور برزویہ کو پچاس لاکھ دینار دے کر اس کتاب کا ترجمہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا، برزویہ جملہ فضائل و کمالات سے آراستہ اور اس عہد کی تمام مشہور زبانوں سے واقف تھا، اس نے ہندوستان پہنچکر یہاں کے دانشوروں سے ظاہر کیا کہ وہ ایک طالب علم ہے اور علم و ہنر کی تحصیل کی غرض سے ہندوستان آیا ہے، کچھ عرصہ کے بعد اسے ایک قابل اعتبار برہمن دوست مل گیا، جس کو اس نے اپنا رازدار بنالیا، اور مختلف حیلوں اور تدبیروں سے کرتکا و دمنکا کا نسخہ خزانہ شاہی سے حاصل کرنے میں (تقریباً ۵۶۰ء) کامیاب ہوگیا، وہ سنسکرت زبان و ادبیات کا بھی ماہر تھا، چنانچہ اس نے پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اسے ساتھ لے کر ایران واپس آیا، مؤلف سبک شناسی محمد تقی بہار مشہدی کی رائے میں حکیم برزویہ نے اس کتاب کو ہندوستان سے ایران لاکر پہلوی میں ترجمہ کیا، احوال و آثار و اشعار رودکی کے مرتب و مؤلف آقای سعید نفیسی بھی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں،

"...... نسخہ از ایں کتاب فراہم کرد و باخود بایران آورد و از زبان سنسکرت بزبان پہلوی ترجمہ کرد۔"[2]

---

[1] مقدمہ چہار دانش از علامی ابوالفضل [2] احوال و آثار و اشعار رودکی ص ۴۳۱

لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ کتاب مذکور ہندوستان میں ہی پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی ہوگی، اس لیے کہ حکیم برزویہ کا برہمن دوست اصل کتاب کو ایران لیجانے کی اجازت کسی حال میں نہیں دے سکتا تھا۔ اگر ترجمہ ایران میں ہوا تو اس کی صورت یہ ہوئی ہوگی کہ حکیم برزویہ نے اصل کتاب کو ہندوستان میں نقل کرلیا ہوگا اور اسی نقل کو لیکر ایران گیا ہوگا۔ انوشیروان اس کتاب کے مطالعہ سے بے حد مسرور ہوا، اور اپنی مملکت کا پورا نظام اس پر موقوف کردیا، اور اس کتاب کی نظم و ترتیب کے لیے حکیم روزگار، فاضل زمانہ بزرگ مہر یا بزرجمہر کو مامور کیا، جو اس کا وزیر و مصاحب بھی تھا، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم برزویہ سنسکرت کتاب کی نقل ہی لے گیا تھا، جسے بزرجمہر نے پہلوی میں ترجمہ کیا، یا حکیم برزویہ کے پہلوی ترجمہ کی اصلاح و ترمیم اور اس کی جدید ترتیب و تنظیم کی۔ انوشیروان نے حکیم برزویہ کو اس کے اس عظیم کارنامے کا صلہ عطا کرنا چاہا تو اس نے استدعا کی کہ صلہ کے بجائے اس کتاب میں اس کے حالات کا ایک باب بڑھادیا جائے، انوشیروان نے اس کو منظور کرلیا اور بزرگ مہر کو اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا،

ایران میں بھی اس کتاب کو انوشیروان اور اس کے اخلاف نے دوسروں سے پوشیدہ رکھا، فردوسی لکھتا ہے کہ بہرام چوبین (ہرمزد شاہ بن انوشیروان کا وزیر و رفیق و امیر لشکر) نے جو شہر کا ایک فرومایہ پہلوان تھا، انوشیروان کے بیٹے ہرمزد شاہ (۵۷۸ء - ۵۹۰ء) کے خازن سے اس کتاب کو حاصل کیا، اور اس کا گہرا مطالعہ کرکے اس کو اپنا دستور العمل بنایا اور اس کے ذریعہ ایران کے ہر طبقہ کو مسخر کرکے خسرو پرویز بن ہرمزد شاہ بن انوشیروان (۵۹۰ء - ۶۱۰ء) کو شکست دیکر ایران کی حکومت پر قابض ہوگیا، اور ہرمزد کو راہ فرار اختیار کرکے روم میں پناہ لینی پڑی۔ شاہنامہ (فردوسی مطبوعہ تہران ج ۵) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

پہلی صدی ہجری کے اوائل میں (۶۴۲ء یں ۷ ویں صدی عیسوی) عربوں کے تسلط کی وجہ سے ایرانی تہذیب و تمدن، مذہب و اخلاق اور سیاست و حکومت میں انقلاب پیدا ہو گیا، شاہ ایران یزدگرد سوم بن شیرویہ بن خسرو پرویز کے ملک و مال کے ساتھ یہ کتاب بھی غارت ہو گئی، ایک طویل مدت کے بعد عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۷۵۲ء-۷۷۵ء) کو اس کتاب کے فوائد معلوم ہوئے، تو بڑی جستجو سے یہ کتاب ملک حبش سے بہم پہنچائی گئی، اور ابو الحسن عبد اللہ ابن المقفع (متوفی ۷۵۷ء یا ۱۴۵ھ) نے پہلی بار اس کا عربی میں ترجمہ کیا، ابن المقفع نے اس میں مزید چھ فصلوں کا اضافہ کیا جو اسلامی اقوال پر مبنی تھے، خلیفہ مامون الرشید کو یہ کتاب بہت محبوب تھی، مامون الرشید (۸۱۳ء-۸۳۳ء) کا وزیر فضل بن سہل سرخسی (متوفی ۲۰۳ھ) مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ایک دن قرآن مجید پڑھ رہا تھا، ایک دوست نے اس سے پوچھا کہ تم نے قرآن کو کیسا پایا؟ فضل نے جواب دیا "خوش چوں کلیلہ و دمنہ".

عرب شاعر ابان بن عبد الحمید اللاحقی یا لاحجی (دوسری صدی ہجری) مداح آل برمک نے برامکہ کے حکم پر کلیلہ و دمنہ کو عربی نظم کا جامہ پہنایا، اس منظوم کلیلہ و دمنہ کے مختلف ابواب کے کل چہتر (۷۶) ابیات اب باقی رہ گئے ہیں، عرب کے متعدد شعراء نے اسے نظم کیا، لیکن ابان ابن عبد الحمید اللاحقی اور علی بن داؤد کاتب کے منظومات معروف ہیں، عبد اللہ بن ہلال الاہوازی نے کلیلہ و دمنہ فارسی کا عربی ترجمہ یحییٰ بن خالد برمکی (وزیر المہدی و ہارون الرشید) کے نام معنون کیا اور سہل بن نوبخت الحکیم نے اسے یحییٰ بن خالد مذکور کے لیے منظوم عربی میں پیش کیا۔[1]

دوسری بار سلسلۂ سامانیہ کے جلیل القدر حکمران ابو الحسن بن نصر بن احمد سامانی نے تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں اپنے وزیر ابو الفضل محمد بن عبید اللہ بلعمی کو حکم دیا کہ اس نسخہ کو

[1] سبک شناسی، محمد تقی بہار ج ۱ ص ۱۵۵

عربی سے دری نثر میں منتقل کیا جائے، مگر یہ دری کلیلہ و دمنہ بھی کلیلہ و دمنہ پہلوی کی شکل دست برد زمانہ کی نذر ہو چکی ہے۔[1] فارسی کے آدم الشعراء رودکی سمرقندی (متوفی ۳۲۹ھ یا ۹۴۰-۹۴۱ء) نے امیر نصر بن احمد سامانی کے ایما اور ابو الفضل بلعمی کی ترغیب پر اس کو فارسی نظم میں منتقل کیا۔ کلیلہ و دمنہ رودکی کا آغاز شعر ذیل سے تھا:-

ہر کہ نا مخت از گذشتہ روزگار ـــ نیز ناموزد ز ہیچ آموزگار

رودکی کا یہ کارنامہ منظوم اب نایاب ہے، اس کے سولہ اشعار فرہنگ اسدی طوسی میں اور کچھ اشعار تحفۃ الملوک میں موجود ہیں، آقای سعید نفیسی کے بیان کے مطابق رودکی کی کلیلہ و دمنہ میں نو ہزار (۹۰۰۰) ابیات تھے نفیسی نے ایک سو پندرہ ابیات تحقیق کے بعد احوال و آثار و اشعار رودکی میں نقل کیے ہیں۔[2]

اوائل قرن ششم میں ابو المظفر بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم غزنوی (۵۱۲ھ-۵۴۷ھ) کو خبر ہوئی کہ ابو المعالی نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید منشی نے عربی نسخہ سے فارسی نثر میں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ شروع کیا ہے، تو اس نے ابو المعالی کی ہمت افزائی کی اور یہ حکم دیا کہ ابن المقفع کے کلیلہ و دمنہ کا ایسی سلیس و سہل فارسی میں ترجمہ کیا جائے جس سے ہر شخص مستفید ہو سکے، ابو المعالی نے اس کی تکمیل کے بعد اس کو بہرام شاہ کے نام معنون کیا، اور یہ کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کے نام سے معروف ہوئی اور کلیلہ و دمنہ ابو المعالی بھی کہتے ہیں، کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ۵۳۸ھ کے درمیان تالیف ہوئی، ابو المعالی نصر اللہ نے اصل سنسکرت کرتکا و دمنکا پر دو تین اسلامی اور ایرانی حکایتیں بھی بڑھا دیں۔[3] کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ابتک موجود ہے اور تہران سے حال ہی میں شائع بھی ہوئی ہے چھٹی اور اوائل ساتویں صدی ہجری کا نامور

[1] بست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۲۲ [2] احوال و آثار و اشعار رودکی، سعید نفیسی ص ۴۳۱-۴۳۲، ص ۸۰۰ وغیرہ
[3] تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق ص ۳۰۹

فاضل و منشی، عوفی، کلیلہ و دمنہ ابو المعالی کی تالیف کے تقریباً سو سال بعد اس کے بارہ میں لباب الالباب (تالیف ۶۱۸ھ یا ۱۲۲۱ء) میں اس طرح رائے زنی کرتا ہے[1]:-

"تا در آخر الزمان و انقراض عالم ہر کس رسالتی نویسد یا در کتاب تفوقی کند متقبس فوائد او تواند بود چہ ترجمہ کلیلہ و دمنہ کہ ساختہ است دست مایۂ جملہ کتاب و اصحاب صنعت و ہیچ کس انگشت بر آن نہ نہادہ است و آن را قدح نکردہ و از خشات پارسیان ہیچ تالیف آن اقبال ندیدہ است و آں قبول نیافتہ"

ترتیب و تنظیم انشاء کے حسن اور دلکش اسلوب نگارش کی بنا پر یہ کتاب نثر فارسی کی بہترین کتابوں میں شمار کیجاتی ہے، یہ اپنے عہد کی انشاء کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اس میں تمام صنائع و بدائع اور ادبی نکات و لطائف کا استعمال ہوا ہے، ادبی صنعتوں میں صنعت موازنہ اور قرینہ سازی نمایاں ہے۔ استدلال و استشہاد میں فارسی و عربی کے اشعار، احادیث نبوی اور بزرگوں کے اقوال کا برمحل استعمال کیا گیا ہے، صنعتوں کی کثرت کے باوجود ابو المعالی ان سے مغلوب نہیں نظر آتا۔ اس کی مسجع نثر کی پیروی بہت سے معروف نثر نگاروں نے کی، جن میں عطا ملک جوینی مولف تاریخ جہاں کشای قابل ذکر ہے، مؤلف ہفت اقلیم امین احمد رازی کی رائے کے مطابق فارسی ادبیات کا کوئی نثری کارنامہ اس قدر تعریف و تحسین کا مستحق نہیں ہے جس قدر کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی، امین احمد رازی نے کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کی تعریف کرتے ہوئے محمد عوفی کے ان تمام جملوں کو من و عن نقل کر دیا ہے جو اوپر درج ہوئے ہیں[2]،

مترادفات، موازنہ و سجع کے استعمال سے عبارت موزوں ہوجاتی اور اس میں خوش آہنگی پیدا ہوجاتی ہے، گرچہ کلیلہ و دمنہ ابو المعالی میں بڑی چابک دستی سے صنعتوں کا استعمال

---

[1] لباب الالباب عوفی ج ۱ ص ۹۲ [2] ہفت اقلیم، امین احمد رازی ص ۲۲۱

کیا گیا ہے، لیکن گلستان سعدی اس صفت میں کلیلہ و دمنہ سے بہت آگے ہے، کلیلہ و دمنہ کے مقدمہ میں ابو المعالی لکھتا ہے کہ ابن المقفع اور رودکی کے ترجموں کے بعد کلیلہ و دمنہ بہت بار ترجمہ کی گئی، لیکن ان تراجم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجمین کا مقصد صرف تحریر حکایات و تقریر سمر تھا نہ کہ تفہیم حکمت و ایضاح موعظت۔ اس لیے ابو المعالی نے آخر الذکر مقصد کو پیش نظر رکھکر اس کے ترجمہ و تالیف کا کام انجام دیا، اور ان قصوں اور افسانوں میں پوشیدہ اسرار و رموز کی توضیح و تشریح بھی کر دی تاکہ ایسی اہمیت و افادیت کی حامل کتاب صرف قصے کہانیوں کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے، لیکن مغلق لغات، عربی عبارتوں کی کثرت، استعارات و تشبیہات و اشارات کی فراوانی کی وجہ سے اکثر قاری فہم معانی سے دور اور بے بہرہ رہ جاتے تھے، اس لیے یہ ترجمہ بھی قبول عام نہ حاصل کر سکا جو ابو المظفر بہرام شاہ کا اصل مقصد تھا۔

محمد تقی بہار نے اپنی تالیف سبک شناسی[1] میں ایک منظوم کلیلہ و دمنہ کے قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے، جسے ساتویں صدی ہجری میں امیر بہاء الدین قانعی طوسی (۶۵۵ھ یا ۱۲۵۷ء) نے ایشیا کوچک کے سلجوقی فرماں روا عز الدین کیکاؤس کے نام معنون کیا تھا، قانعی نے یہ کلیلہ و دمنہ بحر متقارب میں نظم کیا تھا، یہ نسخہ کتاب خانہ حاجی حسین آقا ملک (تہران) میں موجود ہے۔

اس نسخہ کے متعلق سر ڈنسن (Sir Densíon) اپنی کتاب The Ocean of story کے جلد ۵ صفحہ ۲۱ میں لکھتے ہیں کہ ابو المعالی نصر اللہ کی کلیلہ و دمنہ کے بعد احمد بن محمود الطوسی متخلص بر قانعی کا منظوم ترجمہ ہے، یہ نسخہ عز الدین کیکاؤس (جو ۶۴۲ھ میں اپنے باپ کا جانشین بنا) کے نام سے معنون ہوا، سر ڈنسن کا قیاس ہے کہ غالباً یہ نظم ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں تالیف ہوئی[2]۔

نظام الدولہ و الدین امیر شیخ احمد سہیلی نے ملا کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی سبزواری

---

[1] سبک شناسی محمد تقی بہار ج ۲ ص ۲۵۱ [2] مجلہ دانش کدہ ادبیات شمارہ دوم سال چہارم ص ۱۳۳ مقالہ از ڈاکٹر تاراچند و ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی۔

دستوفی ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء۔۱۵۰۵ء) کو حکم دیا کہ عقل و دانش کے اس سفینہ کو نئے لباس میں پیش اور
اس میں جدید نکات کا اضافہ کرے، یہ تالیف اواخر نویں صدی ہجری میں مکمل ہوئی، اس بار
بھی زبان کو سہل بنانے کا لحاظ رکھا گیا، لیکن زمانہ و ماحول کسی کو آسانی سے بغاوت کرنے کی
اجازت نہیں دیتا، اس لیے واعظ حسین کاشفی کی کوشش بھی مروجہ پُر تکلف طرز انشاء کے دائرے
سے نکل سکی، اور لطافت و متانت میں کلیلہ و دمنۂ معالی کے پایہ کو نہ پہنچ سکی، اس کے باوجود
اسے ہندوستان میں بڑی قبولیت و شہرت حاصل ہوئی، کاشفی نے کتاب کی ترتیب و تنظیم میں
تغیر مناسب نہیں سمجھا، اور اس کی قدیم بنیاد یعنی کرتکا و دمنکا کے اصلی ابواب علیحدہ کر کے
اپنی کتاب مرتب کی اور شروع کے دو ابواب جو حکیم بزرگ مہر اور حکیم برزویہ کے احوال و کوائف
سے متعلق تھے، اور بزرگ مہر کے پہلوی ترجمہ سے لیکر عربی و فارسی کے تمام ترجموں میں شامل ہوتے
چلے آرہے تھے، کاشفی نے حذف کر دیے اور باقی چودہ[14] ابواب کو رواں اور سہل عبارت میں
پیش کیا، اور تمثیل میں بھی عربی ابیات کے استعمال سے حتی الامکان احتراز کیا، لیکن حکایتوں
کے دوران میں ضروری احادیث نبوی اور مشہور امثال کے نقل کرنے میں یہ احتیاط قائم نہیں رہی،
جابجا فارسی اشعار بھی نقل کیے گئے، کاشفی نے اپنی اس گرانقدر تالیف کو امیر شیخ احمد سہیلی کے نام
انتساب کیا اور اس کا نام انوار سہیلی رکھا، محمد تقی بہار کی رائے میں انوار سہیلی گویا کلیلہ و دمنۂ ابوالمعالی
کی تلخیص و توضیح ہے، اور اس ترجمہ میں اخلاق محسنی اور مخزن الانشاء وغیرہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے،[1]
شہنشاہ اکبر (۱۵۴۲ء ۔ ۱۶۰۵ء) کی علم پروری اور وطن دوستی کا یہ بین ثبوت ہے کہ اس کے
حکم سے ایک بار پھر ابوالفضل (۹۵۸ھ ۔ ۱۰۱۱ھ/ ۱۵۵۵ء ۔ ۱۶۰۲ء) نے انوار سہیلی یا کلیلہ و دمنہ کو
آسان تر زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی، اور اس عروس کو خلعت زیبا عطا کر کے

---

[1] سبک شناسی محمد تقی بہار، ج ۳ ص ۱۹۰۔

عیار دانش کے نام سے موسوم کیا، اس زمانہ میں انوار سہیلی ہندوستان کے تعلیمی نصاب میں داخل
تھی اور اس کو کلیلہ و دمنۂ بہرام شاہی سے زیادہ قبول عام حاصل تھا، لیکن عربی کے ادق الفاظ
اور فارسی کے مشکل استعارے انوار سہیلی میں بھی موجود تھے، اس لیے شہنشاہ اکبر نے اس کو سہل
زبان میں لکھنے کا حکم دیا، ابوالفضل نے اس کام کو انجام دیا، اور ان دو ابواب کو بھی شامل کر لیا،
جو حکیم بزرگ مہر اور حکیم برزویہ سے متعلق تھے، اور جسے واعظ حسین کاشفی نے نصر اللہ مستوفی کے نسخہ
سے حذف کر کے انوار سہیلی ترتیب دی تھی، ابوالفضل کی طرز نگارش کا زندہ جاوید نمونہ اکبر نامہ
ہے، جس میں اس نے انشاء پردازی کا منفرد طرز اختیار کیا ہے، مگر اس میں نامانوس اور مغلق
الفاظ بکثرت ہیں، اس لئے اگر اکبر نامہ کی طرز نگارش کا مقابلہ عیار دانش سے کیا جائے تو نمایاں
فرق نظر آئے گا، عیار دانش کا طرز ایک عام دبیر کے جیسا ہے، اس میں ابوالفضل نے اگرچہ عنان قلم
پر مضبوط گرفت رکھی ہے، اس کے باوجود اس کا زور قلم کہیں کہیں جولانی دکھا جاتا ہے، لیکن
مجموعی طور پر سہل ممتنع کی مثالیں ملتی ہیں،

ڈاکٹر تاراچند اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے پنچ تنتر پر مبنی تراجم اور اس کے فارسی
نسخوں اور شائع شدہ کتابوں پر نقد کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب پنچ تنتر کے فارسی ترجمے[1]
میں عہد اکبری تک داستانوں کی ترتیب اور اس کے متن میں اتنا تصرف و تغیر ہو چکا تھا کہ اصل
اور ترجموں میں کوئی مطابقت نہیں رہ گئی تھی، ترجموں میں عربی لغات و اصطلاحات کی کثرت
تھی، اکبر نے اپنے زمانہ میں بہت سی سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا، پنچ تنتر کے
ترجمہ کا کام مصطفیٰ خالق داد عباسی کے سپرد کیا، اور حکم دیا کہ ایسی زبان میں ترجمہ کرے جس کو عام
فارسی بھی سمجھ سکیں، مصطفیٰ خالق داد عباسی نے حسب الحکم ترجمہ کر کے پنجاکیانہ کے نام سے موسوم کیا، اس کا
نسخہ دہلی میوزیم میں موجود ہے، پنجاکیانہ پر ڈاکٹر تاراچند سابق سفیر ہند و ایران اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کا ایک مشترک، پُر مغز تحقیقی عالمانہ مقالہ دو قسطوں میں مجلۂ دانش کدۂ ادبیات، شمارہ دوم، شمارہ سوم (تہران) میں شائع ہو چکا ہے۔

عالمی ادبیات میں بہت کم کتابیں کلیلہ و دمنہ کی شہرت و مقبولیت کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اس کی تالیف و ترجمہ کا سلسلہ طویل صدیوں سے جاری ہے، اس سے مختلف ملکوں، ملتوں اور تہذیب و ثقافت کے لوگوں نے یکساں دلچسپی لی ہے، اس کی اہمیت و مقبولیت پر مرورِ ایام کا کوئی اثر نہیں پڑا، اس سے علماء و وزراء، سلاطین و امراء، افسانہ نگاروں اور داستان طرازوں وغیرہ مختلف طبقات کو یکساں دلچسپی ہے، اور وہ سب اپنے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کرتے ہیں۔

براؤن کے بیان کے مطابق ابن المقفع کے عربی ترجمہ کے بعد سریانی زبان میں اس کا ترجمہ ۵۷۰ء میں بود (Buda) یا پارودیو (Parudivot) نامی شخص نے کیا، اس کے بعد کے تمام تراجم و تالیفات کا ماخذ کلیلہ و دمنۂ ابن المقفع ہی رہی[1]، تبتی (Tibetan) میں اس کا ترجمہ اصل سنسکرت نسخہ سے ہوا، اردو میں انوارِ سہیلی کا ترجمہ بستانِ حکمت کے نام سے ہوا، اس کے مترجم فقیر محمد خاں بہادر رسالہ دار المتخلص بہ گویاؔ، لکھنوی ہیں، یہ ترجمہ مطبع نول کشور سے ۱۳۳۲ھ میں شائع ہوا ہے، عیارِ دانش کا مولوی حفیظ الدین نے ۱۸۱۵ء میں خرد افروز کے نام سے ترجمہ کیا، اس کی مقبولیت کا اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ساٹھ زبانوں میں اس کا ترجمہ مختلف زمانوں میں ہوا، ان میں سے چند زبانیں یہ ہیں: عبرانی، لاطینی، اسپانوی، یونانی، انگریزی، روسی، فرانسیسی، اطالوی، سلاوینی، ترکی، آلمانی، ڈنمارکی، چکسلواکی، ہلندی، ایسلندی، سویدی، لستانی، ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، برج بھاشا، تامل، تیلگو،

[1] A. Literary History of Persia. By Brown. G. G vol II P. 350

ملیالی، دکنی، افغانی، گرجی، ملایائی، جاوائی، حبشی، مدورائی، کناڈا، کرناٹک، کناری، مادی، سیامی، اور یدی (yaddich، شمالی یورپ کے یہودیوں کی زبان) وغیرہ۔

زندگی ایک تغیر پذیر نامیاتی حقیقت ہے جس کے پہلو میں مکان و زمان کے تغیر و تبدل کا اثر ظاہر ہوتا رہتا ہے، علم و عقل کے مدارج بلند یا تحصیل کرتے جاتے ہیں، پرانی تحقیقات کی بنیاد پر نئی حقیقتیں منظر عام پر آتی ہیں اور اس سے آگے دریافت و جستجو کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مختلف ملکوں اور زمانوں میں اس کتاب کی ترتیب و تنظیم ہوتی رہی لیکن کسی شخص کو بھی اسکے مندرجہ نکات اور انکی تشریح و توضیح سے مجال انکار نہ ہو سکی، اور ہر دور میں یہ نکات و اشارات انسانوں کے لیے کارآمد سمجھے جاتے رہے، یہ اور بات ہے کہ اسکی تالیفات کی شکلیں اور اندازِ بیان بدلتے رہے لیکن اسکے اصل اصول اپنی جگہ پر قائم رہے، اور نہ صرف یہ کہ اس کتاب کا ترجمہ مختلف عنوانوں اور طرزوں پر ہوتا رہا، بلکہ اس کی بنیاد پر بے شمار اخلاقی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں سبق آموز کتابیں لکھی گئیں،

آخر میں اس کتاب کے ابواب کا خلاصہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے اسکی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا، پنچ تنتر ذیل کے پانچ ابواب پر مشتمل ہے:۔ دوستی کی فرقت و جدائی (۲) حصول دوست یا دوست سازی (۳) جنگ و امن (۴) زمانہ تنگدستی و عسرت، اور (۵) بغیر فکرِ سلیم کے اعمال کا انجام۔ پنچ تنتر کے ان ہی پانچ ابواب کو پہلوی یا عربی میں چودہ[14] ابواب پر پھیلا دیا گیا ہے، جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عیب گو اور نمام کی باتوں سے اجتناب (۲) بدکاروں کا انجام بد (۳) موافقتِ دوستاں اس کے مقاصد و فوائد (۴) دشمنوں کے احوال معلوم کرنا اور انکے حیلوں سے ہوشیار رہنا۔ (۵) غفلت و تساہل کی مذمت (۶) آفتِ تعجیل و ضررِ شتاب کاری (۷) دشمنوں کی بلا سے محفوظ رہنے کے لیے احتیاط و تدبیر (۸) اربابِ مکر پر اعتبار نہ کرنا اور ان سے پرہیز کرنا (۹) عفو و درگذر کے فضائل (۱۰) فزوں طلبی کی برائیاں اور اسکے مذموم نتائج (۱۱) جزائے اعمال و طریقِ مکافات (۱۲) سکون اور وقار کی فضیلتیں (۱۳) اہلِ غدر و خیانت سے احتراز (۱۴) انقلابِ زمانہ پر التفات نہ کرنا بلکہ قضا و قدر پر ایمان کامل رکھنا۔

مشہور مستشرقین اور اُن کی تصنیفات[1]

(جائزہ اور تعارف)

از

جناب سلمان شمسی صاحب ندوی

مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے اور اپنی تحقیقات کی اشاعت کے لئے ہر ممکن وسیلہ کو اختیار کیا جن میں سے چند کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے،

(۱) اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابوں کی تالیف، جن میں اسلامی نقطۂ نظر، قرآن مجید اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو موضوع بنایا جاتا ہے، جن میں سے اکثر نصوص و متون کی تحریفات پر مشتمل ہوتی ہیں،

(۲) رسائل و مجلات کی اشاعت :- جس میں اسلام اور بلاد عربیہ کے مسائل پر بحث ہوتی ہے،

(۳) عالم اسلام میں مشنریوں کا قیام :- جو بظاہر انسانی خدمت اور گرام سدھار کے نام پر کام انجام دیتی ہیں لیکن ساتھ ہی پُرخطر اور دور رس نتائج لوگوں کے دلوں میں چھوڑ جاتی ہیں ان خدمات کے تحت اسپتال، ڈسپنسریوں، دینی کالج، یتیم خانوں اور مہمان خانوں کا بہت سے مقامات پر پورا انتظام موجود ہے، اس کے علاوہ مسیحی نوجوانوں کی بہت سی انجمنیں عالم اسلام

[1] یہ مضمون مصنف کی زیر ترتیب کتاب کا ایک ٹکڑا ہے۔

میں قائم ہو چکی ہیں،

(۴) یونیورسٹیوں اور علمی سمیناروں میں محاضرات و مقالات کے اجتماعات کا انتظام؛ اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے، کہ اسلامی ملکوں کی یونیورسٹیوں اور سمیناروں میں انھیں شرکت کی دعوت دیجاتی ہو چنانچہ قاہرہ، دمشق، رباط، کراچی اور علی گڈھ کے علمی مراکز میں انھیں اظہارِ خیال کا پوری آزادی سے موقع ملتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں،

(۵) انھوں نے اپنے قلم کے زور سے اسلامی ملکوں کی صحافت اور وہاں سے نکلنے والے جرائد و اخبارات کی بڑی تعداد کو خرید لیا ہے، ڈاکٹر مصطفےٰ فرخ اور ڈاکٹر مصطفےٰ خالدی کی مشترکہ کتاب "التبشیر و الاستعمار" جو استشراق کے سلسلہ میں بڑے مرجع یا Sourse کا درجہ حاصل ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو،

"مسیحی کارکنوں نے مصر کی صحافت سے خاص طور سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا، اس کے ذریعہ انھیں عیسائی نظریات کی اشاعت میں جس قدر مدد ملی، وہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں مل سکی ہو، اُن کے بے شمار مضامین مصر سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوتے ہیں جن میں سے اکثر اجرت کے ساتھ اور بہت کم اعزازی طور پر چھپتے ہیں"

(۶) اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے لئے کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں بظاہر صرف عام عناوین سے بحث کی جاتی ہے، یہ کانفرنسیں ۱۷۸۳ء سے لے کر اب تک مسلسل منعقد ہوتی رہی ہیں:-

(۷) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopedia of Islam) کی اشاعت، جو "دائرۃ المعارف" کے نام سے مختلف زبانوں میں شائع ہوتی ہے، اور اس کے

جدید ایڈیشن برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، عربی میں اس کا سب سے پہلا ترجمہ ۱۹۵۶ء میں ہوا، جس کی اب تک ۱۴ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان مستشرقین نے اس کتاب میں اسلام کے نام پر زہر گھول کر خرافات و اباطیل کا ذخیرہ جمع کیا ہے، اور افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک اس کتاب کو ماخذ (Source) کی حیثیت حاصل ہوتی جاتی رہی ہے، اور اس کو کتاب الحوالہ (Reference Book) سمجھا جانے لگا ہے، جو اسلامی ثقافت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، یہ مستشرقین کے مقاصد و وسائل کا مختصر سا جائزہ تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس ضمن میں مشہور مستشرقین، اُن کی اہم تصنیفات اور رسائل کا ذکر بھی کر دیا جائے: جو سامراجی ملکوں میں اُن کی زیرِ نگرانی شائع ہوتے رہے ہیں،

صحافت و رسائل: (الف) ۱۸۲۲ء میں فرانسیسیوں نے مستشرقین کی ایک انجمن قائم کی، اُس کے ماتحت آسیویہ کے نام سے ایک رسالہ نکالا،

(ب) ۱۸۲۳ء میں لندن میں علوم شرقیہ (Oriental Studies) کی ہمت افزائی کی غرض سے ایک انجمن قائم ہوئی، اس کے زیرِ نگرانی رسالہ مجلہ الجمعیۃ الاسیویۃ الملکیۃ " شائع ہوا، اس صدی میں امریکی مستشرقین کے زیرِ اہتمام نکلنے والے رسائل میں مجلۃ الدراسات الشرقیۃ " خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ صوبہ OHIO کے شہر Combier سے شائع ہوتا تھا، اور اس کے مختلف اڈیشن روس، لندن، اور دوسرے مقامات سے شائع ہوتے تھے، معلوم نہیں اس وقت اس نام سے شائع ہوتا ہے یا کسی دوسرے نام سے: اس پر سیاسی سامراج کی پوری چھاپ تھی،

(ج) اس وقت امریکی مستشرقین کے قلم سے نکلنے والے رسائل میں مشہور یہ ہیں:-

(The islamic world Affairs) مجلۃ شئون الشرق الاوسط جو بڑی حد تک سیاست سے متاثر ہے،

(د) سب سے خطرناک رسائل وہ ہیں جو امریکی مشنریاں نکال رہی ہیں، ان میں صموئیل زویمر (S. Zw emer) کے زیرِ ادارت نکلنے والا رسالہ العالم الاسلامی (The muslim world) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یہ رسالہ ۱۹۱۱ء میں پہلی بار نکلا، اور اب بھی (Hart Force) امریکہ سے شائع ہوتا ہے، حال میں اس کے مدیر اعلیٰ کینٹ کراج (K. cragg) تھے،

(ذ) اسی سے ملتا جلتا ایک رسالہ Le Mede Mu-selmane) ہے جو ایک فرانسیسی مستشرق کے زیرِ نگرانی نکلتا ہے،

مشہور مستشرقین اور اُن کی تصنیفات!

اے، جے، آربرے A. J. ArBerry	مشہور انگریز مستشرق ہے، اس کی اسلام دشمنی ضرب المثل ہے. اسلامک انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین میں ہے، آج کل کیمبرج یونیورسٹی

کا پروفیسر ہے، وہ ہمارے معاصر مصری فاضلوں کا استاذ رہ چکا ہے، اسکی مشہور ترین کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

۱- الاسلام الیوم:- ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی،

۲- مقدمۃ لتاریخ التصوف:- ۱۹۴۷ء " " "

۳- التصوف:- ۱۹۵۰ء " " "

۴- ترجمۃ القرآن:- ۱۹۵۰ء " " "

الفرڈ جیوم A. Geom	ہمعصر انگریز ہے تعصب اُس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے لندن یونیورسٹی میں لکچرار ہے، اس کی تحریریں مشنری روح کا غلبہ ہے، اسکی تصنیفات

میں معرکۃ الآرا کتاب "الاسلام" ہے، مصری حکومت نے بہت سے نوجوانوں کو مشرقی زبانوں کی تحقیقات کے لئے اُس کے پاس بھیجا ہے۔

بارون کیرا ذی فو Baron carra de voun	فرانسیسی مستشرق ہے، اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں اس کا نام اہم ترین ہے۔

ایچ - اے، آر، گب H. a. R. GIBB	انگلینڈ کا ہمعصر مستشرق ہے، مصر کی لینگویج اکیڈمی کا ممبر رہا ہے، آج کل امریکہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہے، دائرۃ المعارف کے

مرتبین میں یہ بھی ہے، اس کی اہم تصنیفات یہ ہیں :-

۱- طریق الاسلام : ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی، اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس کا عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۲- الاتجاهات الحديثة فی الاسلام : ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

۳- المذہب المحمدی : یہ بھی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اب تک مختلف ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

۴- الاسلام والمجتمع الغربی اس کی کئی جلدیں ہیں، اس کی تالیف میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔

۵- مجموعۂ مضامین :-

گولڈزیہر Gold Ziehen	علمی بددیانتی اور اسلام دشمنی کے لئے مشہور ہے، دائرۃ المعارف کی ترتیب میں اس کا بھی حصہ رہا ہے

قرآن مجید اور حدیث پر اس کی تصنیفات ہیں، اس کی کتابوں میں تاریخ مذاہب التفسیر الاسلامی کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جس کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے۔

جان، مائی نارڈ Mynard	متعصب امریکی ہے، "رسالۃ دراسات الشرقیہ" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہ چکا ہے، اس رسالہ کے مضامین اس کی زہرافشانی کے شاہد ہیں۔

ایس - ایم - زویمر S. M. Zwemer	مشنری مستشرق ہے، اس لئے اسلام کے ساتھ اس کی دشمنی دوہری ہے، رسالہ "العالم الاسلامی" کا بانی اور کتاب "الاسلام

تحد للعقيدة" کا مصنف ہے، یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب اس کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو مشنریوں کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں پڑھے گئے تھے، اس کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی یاد میں امریکیوں نے ایک اوقاف قائم کیا ہے، جس کے تحت لاہوتی مطالعہ اور مبلغین کی جماعت تیار ہوئی ہے۔

عزیز عطیہ سوریال	مصری مسیحی مستشرق ہے، اسکندریہ کی یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے،

اور اب امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ہے، اسلامی تعلیمات کی تخریب میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس کے لئے اس نے بہت سے وسائل اختیار کئے ہیں، صلیبی جنگوں سے متعلق اس کی بہت سی تصنیفات ہیں :-

جی، فون گرو بارم G. Von Greev Bovrm	یہودی النسل جرمن ہے، بعد میں امریکہ میں سکونت اختیار کر لی، اور تدریس کا شغل اختیار کیا، شیکاگو یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے ہیں، اس کی تصنیفات میں

اسلامی اقدار پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی ہے، لکھنے میں بڑا ماہر ہے، اُس کی مشہور کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں :

۱- اسلام العصور الوسطیٰ :- ۱۹۴۶ء میں پہلی بار چھپی،

۲- الاعیان المحمدیہ :- ۱۹۵۱ء میں چھپی،

۳- محاولات فی شرح الاسلام المعاصر : ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی،

۴- دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیہ : ۱۹۵۴ء " "

۵- الاسلام : مختلف مقالات کا مجموعہ ہے : ۱۹۵۶ء میں چھپی،

۶- الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیہ : ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی

فلپ حتی — P. K. Hitti

لبنانی مسیحی مستشرق ہے، پرنسٹن یونیورسٹی میں پہلے اسلامک اسٹڈیز کے استاد تھے، پھر اس کے ہیڈ ہوگئے، آج کل امریکہ کے وزیر خارجہ کے کاؤنسلر ہیں، ان کی شدید کوشش رہتی ہے، کہ انسانی تہذیب کی تشکیل میں اسلام کی کوتاہی ثابت کی جائے مسلمانوں کی طرف کسی مرتبہ و شرف کی نسبت نہ ہونے پائے،

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۲۹ پر الادب العربی کے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں :

"عربوں میں ادبی زندگی کی علامتیں پہلے نہ تھیں، ان کا ظہور انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا ہے، نئی تحریک کے قائدین کی صف اول میں لبنان کے وہ نصاریٰ ہیں، جنھوں نے امریکی مبلغین کی کوششوں سے تعلیم کی منزل طے کرکے نئی روشنی اخذ کی"

ان کی ساری کوشش یہ رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے علم و فضل کو ناقص قرار دیا جائے ان کی رائے میں یہ کوتاہی اور کمی عصر جدید ہی میں نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر مرحلہ میں رہی ہے ان کی یہ رائے ان کی اپنی تصنیفات میں دیکھی جاسکتی ہے،

ان کی بعض کتابیں یہ ہیں :

۱- تاریخ العرب : اصلاً انگریزی میں ہے، عربی میں بعد میں ترجمہ ہوئی، پوری کتاب

اسلام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن و استہزاء سے بھری ہوئی ہے،

۲- تاریخ سوریا۔

۳- اصل الدروز و دیانتھم۔ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی،

اے، جے، وینسنک — A. J. Wensink

پہلے مصر کی لسانی اکیڈمی کا ممبر تھا، طبیب حسن ہواری نے اس کو الگ کرایا، اس کے نزدیک قرآن مجید رسول اللہ صلعم کی تصنیف ہے، انھوں نے مذہبی اور فلسفیانہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کرکے اس کو لکھا ہے، دیکھئے: "المستشرقون والاسلام" ص ۱۷، اس کی دوسری مشہور کتاب عقیدۃ الاسلام ہے جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی،

ایل ماسینون — L. Massegnon

فرانسیسی مستشرق ہے، شمالی افریقہ میں فرانس کی وزارت نوآبادیات کا ایڈوائزر تھا، مصر کے مشنریوں کا روح رواں ہے، اس نے دنیائے اسلام کا کئی بار سفر کیا، مصر کی لسانی اکیڈمی اور دمشق کی المجمع العلمی العربی کا ممبر، فلسفہ اور تصوف اس کے امتیازی علوم ہیں، اس کی مشہور کتابوں میں الحلاج الصوفی الشہید فی الاسلام ہے، یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ اس کے مقالات و محاضرات کے مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں، دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی ترتیب میں اس کا بڑا حصہ ہے،

ڈی۔ بی۔ میکڈونالڈ — D. B. Macdonald

امریکی مستشرق ہے، یہ بھی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مقالہ نگاروں میں ہے، اس کی مشہور کتابوں میں:

"تطور علم الکلام والنظریۃ الدستوریۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۳ء اور

"الموقف الدینی والحیاۃ فی الاسلام" مطبوعہ ۱۹۰۸ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

مجید قدوری عراق کے عیسائی ہیں، واشنگٹن یونیورسٹی میں اور مڈل ایسٹ اسٹڈیز کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ اور مجلس علوم شرقیہ کے سرگرم رکن ہیں، یہ بھی اسلام کے خاص ناقدوں میں ہیں، ان کی شاہکار کتاب "الحرب والسلام فی الاسلام" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ مطبوعہ مقالات بھی ہیں؛

ڈی ایس، مارگولیس
D.S. Margoliouth

نسلاً انگریز، اور انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین میں سے ہیں، مصر و دمشق کی اکیڈمیوں کے ممبر رہے ہیں، ان کی مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:-

۱- التطورات المبکرة فی الاسلام:- مطبوعہ ۱۹۱۳ء
۲- محمد و مصطلح القرآن: " ۱۹۰۵ء
۳- الجامعة الاسلامیه: " ۱۹۱۲ء

نیکولسن
R. A. Nicholson

مشہور انگریز مستشرق ہے، دائرة المعارف کا مقالہ نگار ہے؛ مصر کی لسانی اکیڈمی کا بھی ممبر رہا ہے، اسلامی فلسفہ و تصوف اس کا خاص موضوع ہے، اس کے باوجود اس کو اسلام کے روحانی نظام ہونے سے اتفاق نہیں ہے اور اس کو وہ سطحی مذہب قرار دیتا ہے، (۱) متصوفوا الاسلام مطبوعہ ۱۹۱۰ء اور (۲) التاریخ الادب العربی: مطبوعہ ۱۹۳۰ء اس کی مشہور کتابیں ہیں،

ہنری لامنس فرانسیسی مستشرق اور دائرة المعارف کا مقالہ نگار ہے، اس کی اسلام دشمنی مشہور ہے، فرانسیسی میں اس کی دو کتابیں ہیں، "اسلام" اور طائف،

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض کے نام اوپر آچکے ہیں:-

کتاب	مصنف	
۱- حیاة محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آرنلڈ ٹوئن بی:	A. Toynbee
۲) الاسلام،	ولیم میور:	William muir
۳- دین الشیعه	الفرڈ گیوم:	A. Gom
۴- تاریخ شارل الکبیر	ڈونالسن:	D.M. Donolson.
۵- الاسلام:	ترپن:	Bishop Turpin.
۶- الاسلام تحد لعقیده	ہنری لامنس	H. Lammens.
۷- دعوة المسلمة	زویمر:	S.M. Zwemer
۸- الاسلام الیوم	کینٹ کراج	K. Cragg.
۹- ترجمة القرآن	اے جے آربرے-	A.J. Arbery
۱۰- تاریخ مذاهب التفسیر الاسلامی،	گولڈزیہر	Gold Ziehir
۱۱- تاریخ العرب	"	"
۱۲- الیهودیة فی الاسلام	فلپ حتی	P. Hitti
۱۳- عقیدة الاسلام	ابراہیم کاش	Abraham Kash
۱۴- الحلاج الصوفی الشهید فی الاسلام	ونسنک	Wensnik
۱۵- الحرب والسلام	مجید قدوری	
۱۶- تطور علم الکلام والفقه والنظریة الدستوریة فی الاسلام۔	لوئی ماسینون	L. Massegnon

۱۷- الاتجاہات الحدیثہ فی الاسلام — میکڈونالڈ — Mecdo Nald

۱۸- طریق السلام — اے آر گب — A.R. Gibb

۱۹- التصوف فی الاسلام — ״

۲۰- مصادر تاریخ القرآن — نیکولسن — Nicholson

۲۱- اصول الاسلام فی البئۃ المسیحیۃ — آرتھر جیفری — Arthur Jeffery

۲۲- مقدمۃ القرآن — آر- بل — R. Bell

۲۳- التطورات المبکرہ فی الاسلام — ״ ״

۲۴- محمد و مطلع الاسلام — مارگولیس — D. S. Marglio us

۲۵- الاسلام — ״ ״ ״

۲۶- الجامعۃ الاسلامیۃ

۲۷- قنطرۃ الی الاسلام — . . . .

۲۸- اسلام العصر الوسطی — اریک بتمان — A. Belmon

۲۹- الاسلام — جی- ون- گرونیبام — Von Greevledum

۳۰- الاعیاد المحمدیہ — ״ ״

۳۱- الوحدۃ والتنوع فی الحضارۃ الاسلامیۃ — ״ ״

۳۲- دراسات فی تاریخ الثقافۃ الاسلامیۃ — ״ ״ ״

مستشرقین کا سب سے بڑا کارنامہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہے، گو یہ بھی بد دیانتی سے خالی نہیں لیکن اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ناگزیر ہے، اس کے اہم مقالہ نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱- ابراہیم کاش — الیہودیہ فی الاسلام کا مصنف ہے،

۲- سی سی- ایڈمز C.C. Adoms — امریکن یونیورسٹی میں استاد رہ چکا ہے، الاسلام فی التجدید فی مصر کا مصنف ہے،

۳- ادوار فرمان E. Ferman — تاریخ المسلمین وفتوحاتہم کا مصنف ہے،

۴- ایڈون کیلوری E Calverry — رسالہ العالم الاسلامی کے اڈیٹر رہ چکے ہیں، انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں بھی حصہ لیا، اور قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی میں استاد رہے،

۵- اریک شرودر — انھوں نے "امت محمد" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں کتاب لکھی تھی،

۶- ایلڈر، Elder — The mus lim world کے اڈیٹر ہیں،

۷- الفرڈ کارلٹن — A. Carllon

۸- ال ایزنبرج — L. Eisembeeg

۹- ڈبلو- ایوانو — W. Iwanow

۱۰- بانجر — F. Balenger

۱۱- اے- باگلیرو — A. Bagliaro.

۱۲- جے- بارتھ، — T. Barth

۱۳- آر۔ پیرٹ — R. Peret -

۱۴- آر۔ بسٹ — R. Besst-

۱۵- بشپ، — Bishop

۱۶- سی۔ سی۔ برگ، — C.C. Berg

۱۷- ایچ۔ ایچ۔ برو — H.H. Brau

۱۸- آئی۔ ال۔ پرنس — I.L Previncsal

۱۹- ار۔ بل، — R. Bell

موصوف نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جن میں اصول الاسلام فی المسیحیہ مطبوعہ ۱۹۳۷ء اور مقدمۃ القرآن مطبوعہ ۱۹۵۳ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۲۰- ام۔ بلنسر — M. Plenser

۲۱- ایف، بل — F. Buhl.

۲۲- وی، ٹی، بوشنر، — V. T. Buchner

۲۳- جے، پیدرسن — J. Poderson

۲۴- ایس۔ ایچ۔ بیکر

۲۵- اے۔ ایس۔ ترتون — A.S. Teiton

۲۶- ارچوڈی، — R.chudi

۲۷- ٹی۔ ایچ۔ ٹائی نابال — T.H. Joynaball

۲۸- گاردفرائی — Gourd Fr. ray

۲۹ ڈبلیو جرکومن — W. Jorkomon

۳۰- جویڈی — Guidi.

۳۱- بی۔ گوئیل — B goil

۳۲- گی۔ ڈوسوڈ، — G. Dussaud.

۳۳- ڈی۔ آل۔ ڈلاوڈیا، — D.L. Dell vid

۳۴- ڈی۔ بور۔ — D. Boer.

۳۵- ڈیٹیرشن۔ — Dielec

۳۶- ای ڈینیٹ — E.Dinet

۳۷- آر روبرٹ — R.Robert

ان کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں،

۱ القوانین الاجتماعیۃ فی القرآن،

۲- القرآن والتوراۃ فی القوانین الاجتماعیۃ، (مطبوعہ ۱۹۲۵ء)

۳۸ ریکنڈرٹ — Recenderf.

۳۹ کے، ایف، زیٹرسن، — K.F. Zettersa.

۴۰ او۔ اسپائیس، — O. Spies

۴۱ ایم، اسٹریک، — M. Streck.

ان کی کتاب تاریخ الحروب الصلیبیہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی،

۴۲ ایچ۔ اسپیر — H. Spyer.

۴۳ — Snouk Horgrovji

۴۴ — R. Slart-meut

۴۳ - بی۔ شریک، B. Schrecch

۴۴ - جے۔ شیلفر J. Shelfar

۴۵ - ایس، مرسر S. Merser.

۴۶ - C. Von Areudonk.

۴۷ - H. Fuches.

۴۸ - کے، فولرز K. Vollers.

۴۹ - ایف۔ ووکا، F Vocca

۴۹ - اے، فیشر، A. Fecher

۵۰ - کارل بروکلمان Karl Brockelman.

موصوف اصلاً جرمن ہیں، جرمن زبان میں عربی ادب کی تاریخ لکھی ہے، تاریخ الشعوب الاسلامیہ بھی انہی کی کتاب ہے، روس کی مجلس علمی کے رکن بھی رہ چکے ہیں،

۵۱ - آر۔ اے، کرن، R. A. Kern

۵۲ - کور۔ A. Cour.

۵۳ - کوشی ولسن، K. Wilson.

۵۴ - کریمرز J. H. Kromers.

۵۵ - لانگ ورتھ ڈامیس، Lohngwarth Dames

۵۶ - T. Luwicri.

۵۷ - Bernard Lewies

ان کی مشہور کتاب العرب فی التاریخ ہے، یہ کتاب سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی، آجکل

صاحب کتاب لندن میں پروفیسر ہیں،

۵۸ - G. Marsais

۵۹ - T. Mengel

۶۰ - Morrison

۶۱ - V. Minorski

۶۲ - نیلینو Naleno

۶۳ - H. S. Nebredg

۶۴ - ہارٹنر Hartner

۶۵ - ہارٹمان Harman.

۶۶ - ان کی کتاب الاسلام والقومیة" شائع ہوئی ہے،

۶۷ - ایچ۔ ڈیون H. D. wrne

۶۸ - ایچ ریڈ، H. Reed

موصوف ٹرکی میں عیسائی مشنری کا کام انجام دے کر بعد میں امریکن یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے، اور کئی کتابیں لکھیں،

۶۹ - M. Houtsma

۷۰ - J. Horovits.

۷۱ - A. Hongman.

۷۲ - A. J. Hwsman

۷۳ - B. Heller.

Fuant

۷۵- ام وات M. wat.

ان کی کتاب "الجبر والاختیار فی الاسلام" شہرت عام حاصل کر چکی ہے،

۷۶- جے واکر، J. Walker

۷۷- پی، وٹک P. Witteck

۷۸- T. H. Wair

۷۹- C. young

۸۰- J. Welhouser.

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے علاوہ انھوں نے اس کا اختصار

۱- موجز دائرۃ المعارف الاسلامیہ Short Encyclopedia of Islam

۲- دائرۃ المعارف من Encyclo Pedia of Religion and Ethicks قسم الدین،

۳- دائرۃ المعارف العلوم الاجتماعیہ Encyclopedia of Social Science

۴- او دراسۃ التاریخ Study in History

لیکن ان سبھوں کو اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے،

کتابیات

۱- التبشیر والاستعمار، (عربی) ڈاکٹر عمر فرخ — مصطفےٰ خالدی

۲- المستشرقون والاسلام، عربی — طیب حسن ہواری

۳- الاسلام غداً " — دکتور محمد البہی

۴- الاسلام علی مفترق الطریق " — محمد اسد (لیوپولڈ)

۵- المبشرون والمستشرقین، " — ڈاکٹر محمد البہی

۶- الاستشراق، مالہ وما علیہ — ڈاکٹر سباعی

۷- حرکات ھدامۃ، ×

۸- R. K. Siddiqi orientalstudies

۹- اسلامی ممالک میں مغربیت کی کشمکش — سید ابو الحسن علی ندوی،

۱۰- السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر سباعی،

۱۱- رسائل و مجلات،

جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط

از جناب کبیر احمد صاحب جائسی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شاہانِ صفویہ اور مغلوں کے تعلقات شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں زیادہ مستحکم ہوئے، جب وہ شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہندوستان چھوڑ کر ایران جانے پر مجبور ہوا، ایران میں شہنشاہ طہماسپ نے اس کے شایان شان پذیرائی کی اور ہر طرح سے اس کی مدد کر کے اس کے تخت و تاج کو واپس دلانے کی پوری کوشش کی، شاہ طہماسپ کی اس ہمدردی اور محبت کا ہمایوں عمر بھر معترف رہا، اس کے انتقال کے بعد جب جلال الدین اکبر تخت نشین ہوا، تو شاہانِ صفویہ سے اس کے بھی بڑے اچھے تعلقات رہے، اور دونوں میں مراسلت و مکاتبت بھی رہی، تاریخوں میں ان کے چند خطوط ملتے ہیں[1]، اکبر کے انتقال کے بعد جب نور الدین جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر ایران کے بادشاہ سے تعلقات شگفتہ رکھے اور جہانگیر اور شاہ عباس میں مراسلت اور مکاتبت کی رسم جاری رہی، ان دونوں بادشاہوں کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عباس کے قندھار پر بزور قبضہ کے بعد ان کے تعلقات کی بنیادیں ہل گئیں، اس سلسلہ میں قندھار کے قضیہ پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے، اگر جہانگیر، شاہجہاں کی بغاوت فرو کرنے میں لگ جاتا تو ممکن تھا کہ قندھار کو شاہ عباس سے بزور واپس لینے کی کوشش کرتا، قندھار کے مسئلہ کو

[1] زندگانی شاہ عباس، ج ۳، ص ۸۲

نصر اللہ فلسفی نے زندگانی شاہ عباس اول میں تفصیل سے بیان کیا ہے[1]، یہاں اسکا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں شاہانِ صفویہ کی حکومت ایران میں قائم ہوئی اُس زمانے میں قندھار، خراسان، مرو، خوارزم، سیستان، کابل اور بدخشاں، ابو الغازی سلطان حسین میرزا بایقرا کے زیر نگیں تھے، جو امیر تیمور کے اخلاف میں تھا، سلطان حسین کے انتقال کے بعد ۹۱۲ھ میں جانشینی کے مسئلہ پر اس کے لڑکوں میں اختلاف ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان حسین کی سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی، اور خراسان پر محمد خاں شیبانی کا قبضہ ہو گیا، یہ چنگیز خاں کے لڑکے جوجی خاں کے اخلاف میں تھا، قندھار پر ظہیر الدین بابر کا قبضہ ہوا جو تیمور کے اخلاف میں اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ہے، بابر نے اس کی حکمرانی اپنے لڑکے میرزا کامران کے سپرد کر دی تھی،

۹۴۳ھ میں شاہ طہماسپ اول نے قندھار کے قلعہ پر فوج کشی کی، وہاں کے لوگ مدافعت نہ کر سکے اور قندھار شاہ طہماسپ اول کے قبضہ میں چلا گیا، قبضہ کے بعد جب طہماسپ قزوین واپس گیا تو میرزا کامران نے لاہور سے ایک بڑا لشکر ساتھ لیا اور قندھار پر حملہ کر کے اس کو واپس لے لیا، شاہ طہماسپ اس وقت سلطان سلیمان خاں سے جنگ میں مصروف تھا، اسلیے قندھار کے معاملہ پر توجہ نہ کر سکا، اور وہ مرزا کامران کے قبضہ میں رہا،

بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں اس کے تخت و تاج کا وارث قرار پایا، لیکن جلد ہی اس کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا پڑا، اس نے شاہ طہماسپ سے ایران میں پناہ گزیں ہونے کی درخواست کی، جو قبول ہوئی، اور ہمایوں ایران چلا گیا،

[1] زندگانی شاہ عباس، ص ۹۴ تا ۱۰۸ ج ۴

یہاں ہمایوں کے کچھ دنوں قیام کے بعد شاہ طہماسپ نے اپنے ایک لڑکے سلطان مراد مرزا کو ایک بڑا لشکر دے کر ہمایوں کے ساتھ کیا کہ وہ ہندوستان پر دوبارہ قبضہ میں اس کی امداد کرے۔ ہمایوں، شاہ عباس کی اس ہمدردی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے وعدہ کیا کہ جب وہ دوبارہ اپنی سلطنت پر قابض ہو جائے گا تو قندھار کو ایرانی حکومت کا ایک حصہ تسلیم کرے گا، لیکن اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس وعدہ کو پورا نہیں کیا، یہاں تک کہ ۹۶۳ھ میں کوٹھے سے گرنے سے اس کی موت ہوگئی۔

ہمایوں کے انتقال کے بعد شاہ طہماسپ نے قندھار کو بزورِ شمشیر واپس لینے کا مصمم ارادہ کرلیا، اور اپنے بھتیجے سلطان حسین میرزا کو اس مہم پر متعین کیا، اس نے ۹۶۵ھ میں قندھار پر قبضہ کرکے اس کو ایرانی سلطنت کا جزو بنا لیا۔

شاہ عباس جب تخت نشین ہوا تو اس کو اپنے کئی مخالفوں کا سامنا کرنا پڑا، اس زمانے میں قندھار پر دو صفوی شاہزادوں کی حکومت تھی، جو بیرونی حملہ آوروں سے سخت پریشان تھے، مگر اس وقت شاہ عباس خود مخالفوں کو زیر کرنے میں مشغول تھا، اس لیے ان شہزادگان کو اس سے کسی قسم کی مدد ملنے کی امید نہ تھی، اس لیے وہ مجبوراً اکبر کی پناہ میں چلے گئے، اور قندھار کی حکومت انھوں نے اکبر کے سپرد کردی، اس طرح ۱۰۰۳ھ میں قندھار پھر قلمرو ہند میں شامل ہوگیا، شاہ عباس، اکبر کا ایک بزرگ کی طرح ادب کرتا تھا، اس لیے مخالفوں کو زیر کرنے کے بعد بھی اس نے قندھار پر حملہ نہیں کیا، اور اس کو اکبر کے پاس رہنے دیا۔

اکبر کے انتقال کے بعد جب جہانگیر تخت و تاج کا وارث ہوا، اس زمانے میں شاہ عباس آذربائیجان اور گرجستان میں ترکانِ عثمانی سے نبرد آزما تھا، مگر جنگ میں مشغول ہونے

کے باوجود اس نے جہانگیر کو تعزیت کا خط لکھا اور اپنے سفیر کے ذریعہ اس کو بھیجا، اس کے بعد دونوں ملکوں میں سفراء کی آمد و رفت شروع ہوگئی، اور شاہ عباس براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرح سے قندھار کی واپسی کا مطالبہ کرتا رہا۔

۱۰۲۷ھ میں جہانگیر نے خان عالم کو اپنا سفیر بنا کر ایران بھیجا، اور اس کے ہاتھ خط کے ساتھ گراں بہا تحائف بھی بھیجے، یہ سفیر شاہ عباس کے پاس دو سال تک مقیم رہا، ۱۰۲۹ھ میں اسے ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی، اور شاہ عباس نے خان عالم کے ساتھ اپنے ایک سردار زینل بیگ بیگدلی شاملو کو خط اور بیش قیمت تحائف دے کر جہانگیر کے پاس بھیجا، شاہ عباس نے اس سفیر کے ہاتھ جو خط بھیجا تھا اس میں قندھار کی واپسی کا کوئی مطالبہ نہیں تھا، لیکن اپنے سفیر کو زبانی سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں جہانگیر اور اس کے درباریوں سے بات چیت کرے، شاہ عباس نے خان عالم سے چلتے وقت کہا تھا:

"خصوصیت و یگانگی میانۂ ما و حضرت پادشاہ والا جاہ زیادہ از آنست کہ با یکدیگر مضائقہ بالکاء و مملکت داشتہ باشیم، لیکن در باب قندھار کہ داخلِ خراسان و ملک موروثِ ایں برادر دوستی دوست است، مردم دور و نزدیک کہ چشم بر امور متعارفۂ صوری دارند و از عالمِ معنی بیخبر، سخنانِ لایعنی در محافل و انجمنہا بر زبان آوردہ حمل بر نوعِ دیگر می نماید، سزاوارِ محبت و مقتضاءِ طرفین آنست کہ آں برادر کامگار بجہت رفع طعن اضداد آں ملک را کہ از ولایت ہندوستاں بغایت دور و دریں میانہ سنگِ شاہراہِ محبت است، بایں برادر مرحمت فرمایند، و اگر بازگذاشتنِ آں بر طبعِ شریفِ آں حضرت بسیار دشوار باشد، با رضای خاطر

الور را بر مطالب عالیۂ دنیوی راجع می دانیم، اما برہم سیر و تنکار رباں حدود

خواہیم آمد کہ چند روزی باتفاق منسوبانِ آنحضرت در شکارگاہ ہای آن ولایت بنشاطِ سیر و شکار پرداختہ باز گردیم، و از منسوبانِ آنحضرت راہ و رسم مہمان پذیری و میزبانی بظہور آید و بر عالمیان ظاہر گردد کہ بازگذاشتن آن ملک بایشان محض خصوصیت و یگانگی است، و درمیانہ مغایرت و جدائی نیست[1]"

شاہ عباس کا سفیر زینل بیگ لاہور آیا جہاں جہانگیر مقیم تھا، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو تعظیم و تکریم کے مراسم ادا نہیں کیے، صرف خط اور تحائف جہانگیر کے سامنے پیش کر دیے۔ اس پر جہانگیر کو سخت تعجب ہوا، اور بہت برہم ہوا، اس نے درباری آداب ادا کرنے کی طرف زینل بیگ کو توجہ دلائی اور حکم دیا کہ جس طرح دوسرے سفراء دربار کے مراسم ادا کرتے ہیں وہ بھی ادا کرے، مگر اس نے نہیں کیا، چند ہی دنوں کے بعد جہانگیر جشنِ ولادت منانے کے لیے لاہور سے دہلی چلا گیا، اور جاتے وقت ایرانی سفیر کو واپسی کی اجازت بھی نہ دی، زینل بیگ کو چونکہ قندھار کے مسئلہ میں جہانگیر اور اس کے درباریوں سے کوئی صاف جواب نہیں ملا تھا، اس نے یہ طے کر لیا کہ بلا اجازت ایران چلا جائے، لیکن کچھ تحائف جو اس کے ساتھ نہ آسکے تھے، اب موصول ہوئے، اس لیے وہ مجبوراً ان کو پیش کرنے کے لیے دہلی گیا، وہاں بھی اس کو قندھار کے سلسلہ میں کوئی صاف جواب نہیں ملا، اس نے ان تمام معاملات سے شاہ عباس کو مطلع کیا، شاہ عباس نے سمجھ لیا کہ اب مروت اور محبت سے قندھار ہاتھ آنے والا نہیں، اس لیے ۱۰۳۱ھ میں خراسان گیا اور وہاں سے سیر و شکار کے بہانہ سے عازمِ قندھار ہوا، اس زمانے میں جہانگیر کی طرف سے قندھار کا حاکم عبدالعزیز خاں تھا، اس کو شاہ عباس نے پیغام بھیجا:-

۱؎ بحوالہ زندگانی شاہ عباس، ج ۴، ص ۹۸، چاپ تہران ۱۳۴۱ھ

"...... چون در سفر خیر اثر خراسان کہ بنا بر مصالح ملکی اتفاق افتادہ از فراہ متوجہ سیر و شکارِ آن حدود دیدیم، طریق آنکہ توجہ موکب ہمایون را بآن طرف محض سیر و شکار تصور نمودہ از روی یکدلی و یگانگی باستقبال آمدہ سعادت رکاب بوسی دریابند، کہ چند روزی کہ درین حدود بنشاطِ سیر و پردازیم، ایشان نیز در رکاب اشرف بودہ از جانب برادر کامگار میہمان پذیر بودہ لوازمِ میزبانی بظہور آورند و خاطر مطمئن و آسودہ دارند کہ سوای اعزاز و احترام نسبت بملازمان حضرت پادشاہ والاجاہ برادر بجان و دل برابر امری محظور خاطر صفا آئین نیست، و غرضِ اصلی ازین نہضت بنوعی کہ بخانِ عالم گفتہ بودیم، آنست کہ بر عالمیان بتخصیص معاندان اوزبکیہ قرب و جوار طرفین ظاہر گردد کہ مملکتِ ما و شما یکی است، و درمیانہ جدائی نیست و حمل بر نوع دیگر نکنند...[1]"

شاہ عباس کے اس پیغام کے جواب میں عبدالعزیز خاں نے لکھا کہ وہ اس ارادہ سے باز رہے، اور واپس چلا جائے، ورنہ وہ اور اس کے ساتھی جنگ سے دریغ نہ کریں گے، شاہ عباس قندھار پر حملہ کے لیے بہانہ ڈھونڈھتا تھا، اس جواب کے پاتے ہی قندھار کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا، جہانگیر کو اس کی خبر ملی تو اس کو بڑا تعجب ہوا، اس کو شاہ عباس جیسے دوست سے اس طرح کے حملے کی توقع نہ تھی، اس لیے اس واقعہ کا جہانگیر پر بڑا سخت ردعمل ہوا، بقول نصر اللہ فلسفی "چون خبر پیش رفتنِ شاہ عباس را بسوی قندھار شنید مصمم شد کہ با قوای فراوان بسوی ایران آید، و سوگند خورد کہ پس از نجات دادنِ قندھار تا اصفہان پیش رود[2]"

۱؎ بحوالہ زندگانی شاہ عباس، ج ۴، ص ۹۹-۱۰۰ ۲؎ ایضاً ص ۱۰۰

اس کے بعد جہانگیر نے قندھار پر حملہ کے لیے عجلت کے ساتھ اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور اس کی کمان شاہزادہ خرم (شاہجہاں) کے سپرد کی لیکن اسی زمانے میں نورجہاں اور خرم کے اختلافات حد سے زیادہ بڑھ گئے، اور وہ جہانگیر سے بغاوت کر بیٹھا جہانگیر اسکی بغاوت کو فرو کرنے میں مشغول ہو گیا، اس لیے اس کی فوج قندھار پر حملہ نہ کر سکی، شاہ عباس نے قندھار کو فتح کرنے کے بعد دو بڑی بڑی خالص سونے کی کنجیاں بنوائیں اور محبت آمیز خط کے ساتھ جہانگیر کے پاس بھیجیں، یہ خط تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ خط مجھکو ایک قدیم بیاض میں بھی ملا ہے، اس کے ساتھ اسی سلسلہ کے دو خطوط ایسے بھی ہیں جو ابھی تک کہیں میری نظر سے نہیں گذرے، اس لیے بیاض کا سرسری تعارف کرانے کے بعد وہ خطوط نقل کیے جاتے ہیں،

یہ بیاض انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانہ میں ہے، اور اس کا نمبر متفرقات ۵ تقطیع "۵ × ۸" کی ہے، اس کے اوراق پر زیادہ تر انتخاب اشعار درج ہے، بیاض میں حسب ذیل چار ترقیمے ہیں:۔

(۱) تحریر فی التاریخ ۲۴ شہر محرم الحرام ۱۰۳۳ھ در دار الخلافہ آگرہ تحریر یافت۔

(۲) تمت، تمام شد روز پنجشنبہ در مقام قلعہ ماند و لب حوض جنبل تاریخ ۱۹ ار سنہ ۱۰۳۶ھ۔

(۳) تاریخ شانزدہم شہر رمضان المبارک سنہ ۱۰۵۹ھ در دار المومنین حیدرآباد قلمی گردید احقر الفقیر علی اکبر سبزواری

(۴) شہر ربیع الاول سنہ ۱۰۲۰ھ ...... در بلدہ آگرہ تحریر یافت۔

ان ترقیموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیاض چار مختلف بیاضوں پر مشتمل ہوگی، بیاض پر کوئی مہر نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کا اصل مالک کون تھا، لیکن

دو ترقیمے اس کا آگرہ میں لکھا جانا ثابت کر رہے ہیں، اور جہانگیر اور شاہ عباس کے خطوط کی شمولیت سے اور بھی اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ یہ بیاض کسی ایسے شخص کی ملکیت رہی ہوگی جس کا دربار سے قریبی تعلق رہا ہوگا، مگر سردست اس قیاس کی کوئی داخلی اور خارجی شہادت پیش کرنا مشکل ہے، اس بیاض میں چند اوراق کے بعد سب سے پہلے جو خط ملتا ہے اسکا عنوان ہے "نقل کتابت شاہ عباس بحضرت ظل اللہ شاہ نور الدین جہانگیر"

اس خط کا متن درج ذیل ہے، مگر اس متن اور اُس متن میں قدرے اختلاف ہے جو زندگانی شاہ عباس جلد چہارم ص ۱۰۳ - ۱۰۴ پر درج ہے، چونکہ اس وقت متن کو مرتب کرنا مقصود نہیں ہے، اس لیے یہاں زندگانی شاہ عباس سے یہ خط نقل کیا جاتا ہے۔

"نسایم دعواتی کہ از نفحات اجابت آں غنچۂ مراد شگفتہ نکہت فزای مشام یگانگی باشد، ولوامع مدحاتی کہ از لمعات خلوص بخش انجمن اتحاد منور گشتہ ظلمت زدای خاطر بیگانگی گردد، عطر بزم خلت و ولای اعلیٰ حضرت ظل الٰہی و شمع جمع آں نور پرور والٰہی گردانیدہ مشہود رای انور و مکشوف ضمیر منیر ضیاگستر میگرداند کہ بر دل دانش پسند و خاطر آسمان پیوند آں برادر بجان برابر کہ آئینہ چہرہ دانش و بینش و مرآت جمال حقایق آفرینش است عکس پذیر خواہد بود کہ بعد از سنوح قضیۂ ناگزیر نواب جنت مکان علیین آشیان شاہ بابام انار اللہ برہانہ، چوں قسم قضایا در ایران روی دادہ بعض ممالک از تصرف منسوبان این دودمان ولایت مکان بیرون رفتہ بود، چون این نیازمند درگاہ بی نیاز مقلد امور سلطنت شد، بہمین توفیقات الٰہی و حسن توجہ دوستان انتزاع جمیع ممالک کہ در تصرف مخالفان بود میدانستیم، متعرض آں نشدہ از عالم اتحاد و برادری منزہ بودیم کہ ایشان نیز بطریق آبا و اجداد جنت مقام خود در تفویض آں

توجه مبذول فرمایند، چون بتغافل گذرانیدند مکرر بنامه و پیام وکنایه و صریح تصریح
طلب آن نمودیم که شاید در نظر همت ایشان این ملک حقیر قابل مضایقه نبوده،
مقرر فرمایند که بتصرف منسوبان این دودمان داده، رفع طعن اعدای و بدگویان
وقطع زبان درازی عیب جویان گردد، چمی تیسر این امر او در عهدهٔ تعویق و تاخیر
انداختند، وچون حقیقت این گفتگوها درمیان دوست و دشمن اشتهار یافت
و از آن جانب جواب مشعر برد و قبول نرسید، بخاطر عاطر رسید که طرح سیر و شکار
قندهار اندازیم، شاید بدین وسیلهٔ گماشتگان آن برادر نامدار کامگار از روی
روابط الفت وخصوصیتی که درمیانه مسلوک است، موکب اقبال را استقبال
نموده بخدمت اشرف فائز گردند، و مجدداً به عالمیان رسوخ قواعد یگانگی
طرفین ظاهر شده باعث زبان کوتهی حاسدان و بدگویان شود، بدین عزیمت
بی یراق قلعه گیری متوجه شده، چون بالکای فراه رسیدیم منشور عاطفت مبنی بر
اظهار ارادهٔ سیر و شکار قندهار بحاکم آنجا فرستادیم که مهمان پذیر بوده باشد، و عزت
آثار خواجه باقی کرگیراق را نیز طلب فرموده بحاکم و امرای که در قلعه بودند پیغام دادیم
که میانه اعلی حضرت پادشاه ظل الله و نواب همایون ما جدائی نیست والکائی که همت
از همدیگر می دانیم و ما بطریق سیر متوجه آن صوبیم، نوعی نکنند که کلفت خاطری بهم
رسد، ایشان مضمون حکم وپیغام مصلحت انجام را بگوش حقیقت نیوش نشنیده
و مراسم الفت و اتحاد جانبین را منظور نداشته اظهار تمرد و عصیان نمودند، و چون
بحوالی قلعه رسیدیم باز عزت آثار مشار الیه را طلب فرموده آنچه لازمهٔ نصیحت
بود باو گفته فرستادیم و تا ده روز دیگر عساکر منصوره را قدغن فرمودیم که پیرامون

حصار نگردند، نصائح سودمند نیامد و در مخالفت اصرار نمودند، چون بیش ازین مسامحه
گنجایش نداشت، با وجود عدم اسباب قلعه گیری بلشکر قزلباش بتسخیر قلعه مشغول شده
و در اندک فرصتی غازیان برج و باره را با زمین هموار نموده کار بر اهل قلعه تنگ
شده امان خواستند، ما نیز همان روابط محبت را که از قدیم الایام فیما بین این دو
سلسلهٔ رفیعه مسلوک بوده، و طریقهٔ برادری که مجدداً از زمان میرزائی آن اورنگ
نشین بارگاه جاه و جلال میانهٔ ایشان و نواب همایون ما بنوعی استقرار یافته
که رشک فرمای سلاطین روی زمین است، منظور داشته بمقتضای مروت جبلی
تقصیرات و زلات ایشان را بعفو مقرون فرموده مشمول عواطف و عنایات
سالماً غانماً باتفاق رفعت پناه نظاماً حیدر بیگ یوزباشی، که از صوفیان صادق
قدیم این درگاه است، روانهٔ درگاه معلی گردانیدیم، حقا که بنیاد وداد و اتحاد موروثی
ومکتسبی از جانب این دولتخواه بمرتبهٔ مشید و مستحکم است که بجهت حسد و بعضی امور
که بحسب تقدیر از کمین امکان بمنصهٔ ظهور آمده باشد، خلل پذیر گردد:

میان ما و تو رسم جفا نخواهد بود — بجز طریقهٔ مهر و وفا نخواهد بود

هرچه آنکه از آن جانب نیز همین شیوهٔ مرضیه مسلوک بوده بعضی امور جزئیه را منظور
انظار خجسته آثار نفرموده اگر خدشهٔ بر عارض الفت ظاهر شده باشد، بحسن عطوفت ذاتی
ومحبت ارثی در ازالهٔ آن کوشیده، گلشن همیشه بهار خلت ویگانگی را سرسبز و خرم گردانیده
همگی همت گردون اساس بتاکید قواعد وفاق و تصفیهٔ مناهل اتفاق که نظام بخش انفس
و آفاق است، مصروف فرمایند و کل ممالک محروسهٔ ما را بخود متعلق دانسته هر کس خواهند
شفقت فرموده اعلام بخشند، که بلا مضایقه باو سپرده میشود، این جزویات را خود چه قدر

و اعتبار باشند، امرا و حکامی کہ در قلعہ بودند اگرچہ مرتکب امری چند کہ منافی مراتب دوستی بود شدند، اما آنچہ واقع شدہ است از جانب ماست، و ایشان لازمۂ نوکری و شرط جانسپاری بتقدیم رسانیدہ اند۔ الیقین کہ آنحضرت نیز شفقت شاہانہ و مرحمت پادشاہانہ شامل حال ایشان خواہند فرمود و ما را شرمندہ نخواہند ساخت، زیادہ چہ اطناب نماید، ہموارہ چتر فرقدسای ہم آغوش تائیدات غیبی باد۔"

اس کے بعد اسی صفحہ پر دوسرا خط اس عنوان سے ہے: "نقل کتابت شاہ عباس کہ ببندگان حضرت نورالدین جہانگیر نوشتہ شد۔" جس کا متن حسب ذیل ہے:۔

[ص ۱۶] "برادر عزیز بجان برابر، آن پادشاہ دانشور عاقبت اندیش، سعادت یار، منظورِ انظار حضرت آفریدگار را واضح لائح باشد کہ چون از تلونِ روزگار چنان واقعہ شد کہ قندھار را صوفیان صافی طویت (؟) این دودمانِ علیہ بتصرف درآوردند ہرچند خود این معنی راضی نبود، اما خود انصاف دہند کہ در عالم یگانگی نگہداشت قندھار (کلمہ ای از بین رفتہ است) و در بود با وجود عذر خواہی نمودہ می نماید کہ اگر خواہند اصفہان و خراسان را پیشکش ملازمانِ ایشان [عبارت ص ۱۶ برین کلمہ تمام شود، بعد از بیست و چند اوراق، ورقی بیاید کہ بر آن مکتوبی بعنوان "نقل جواب مراسلۂ شاہ عباس کہ ببندگان حضرت نوشتہ" مندرج است۔ قبلاً سطر چند ہم ہست کہ جزوِ آخرین مکتوبی معلوم میشود، گمان غالب بندہ این است کہ آن عبارت مربوط باین مکتوب است بندہ آن عبارت را اینجا می نویسد] نماید شنیدہ شد کہ در لاہور جار زدہ اند کہ ہیچکس نام قندھار نبرد و ملکہ بگوید کہ نام اصفہان و عراق است، ہرگاہ بایں شدت میسر باشد چہ تصدیع می کنند چون بچہ اندازہ؟ ([بخواہند ؟] ہر جا کہ فرمایند قرچیہ غلام قورچی بجنگ رو بروی لشکر شود:

دم از مہر زن باکین دہ پیام   حکایت برایں ختم شد والسلام

یہ خط میری نظر سے کسی بھی تاریخ کی کتاب میں نہیں گذرا۔ اگر یہ خط صحیح ہے اور اس کا متن بالکل ٹھیک نقل ہوا ہے تو پھر ہم کو جہانگیر اور شاہ عباس کے تعلقات پر پھر سے نظر ڈالنی ہوگی۔ اس سلسلہ کا سب سے دلچسپ خط وہ ہے جو اس عبارت کے بعد اس بیاض میں درج ہے۔ ہم اس موقع پر اس کی نقل درج کرتے ہیں۔ بعد ازاں اپنی گذارش پیش کریں گے۔

نقل جواب مراسلۂ شاہ عباس کہ ببندگانِ حضرت نوشتہ:۔

"مضمون نامۂ بلاغت میمون برادر عزیز ارجمند خلاصۂ خاندانِ حشمت و عزت شاہ عباس بلحاظ ملکوت ناظر و بہجت تازہ روی نمود و آنچہ در باب تدبیرات جنگ و صف کشیدن نوشتہ اند چہ بہ از ین دل چنان میخواہد کہ این سانحہ چنان بمعرکہ آید، شایانِ بزرگ گروہ ہای ایزدی باشند، آنچہ در اظہار عرض تجمل بزرگی خود ساختہ بود این لائق بزرگان و علاقہ زادگان نبود، خاطرِ ہمایون ما بس گران آمد، ہرچہ عیان است چہ حاجت بیان است، وقتی کہ بندگان حضرت صاحبقرانی ملکہای عراق و خراسان و روم را در تحت تصرف داشتہ اند، چہ قدر رحمای ملک بحرو در ضبط بود و ہرگز لاف خود و خود پرستی نزدند با وجود حشمت و بختیاری آنحضرت و سخن سروری از زبان نگذشتہ بتوفیق اللہ تعالیٰ ہیچ پادشاہی در سلطنت و لوازم جہان آرائی و جہانبانی کم و کاستی نیست و ہمیشہ این سلسلۂ علیہ گورگانی صاحبقرانی با عدای دین و دولت و باغیان و دشمنان ملک و ملت مظفر و منصور آمدہ!

بزرگش نخوانند اہلِ خرد   کہ نام بزرگان بزشتی برد

بترس از غلط کاری روزگار   کہ چون تو بسی را غلط کردہ گار

ہرگاہ کہ ملازمان رفیع الشان مجوز این معنی باشند و زیادتی و پیش دستی نمایند لازم است کہ این جانب نیز بندگان ہواخواہان و خادمان دولت پناہ امر عالی معالی شود کہ بزور بازوی شجاعان و غازیانِ سعادت کیش و ہزبران جنگ نہاد ملک

خراسان و عراق را پایمال حوادث بگردانند۔"

والسلام

مذکورۂ بالا دونوں خطوط کے سلسلے میں ابھی کئی باتیں تحقیق طلب ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ عباس کا خط کس سفیر کے ذریعہ ہندوستان آیا، دوسری یہ کہ جہانگیر کا خط لے کر ایران کون گیا؟ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جہانگیر کے اس تلخ و تند لہجہ کا شاہ عباس پر کیا اثر پڑا ہوگا، کیا واقعی یہ خط شاہ عباس تک پہنچا یا صرف لکھا گیا، پھر سیاسی مصالح کے پیش نظر اس کو بھیجنا مناسب نہیں سمجھا گیا؟ یہ تمام سوالات تاریخ سے متعلق ہیں، اس لیے ہم ان کا جواب مورخین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ان خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

کیا شیخ حمید الدین ناگوری فیضی کے دادا تھے؟

از جناب محمد طیب صاحب صدیقی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

فیضی یکم شعبان ۹۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کیا، وہ عربی النسل تھے، سرزمین یمن ان کے اجداد کا وطن تھا، شیخ موسیٰ جو ان کی پانچویں پشت میں ہیں، نویں صدی میں سیوستان کے قصبہ ریل میں آباد ہوئے، دسویں صدی ہجری کے ابتدا میں فیضی کے دادا شیخ خضر ہندوستان آئے اور ناگور میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں ایک متمول عرب خاندان میں شادی کرلی،

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری فیضی کے اجداد میں ہیں،

صاحب خلاصۃ الکلام نے تو پورے اعتماد کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ شیخ خضر کے والد کا نام قاضی حمید الدین ناگوری ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"شیخ ابوالفیض فیضی و فیاضی بن شیخ مبارک بن شیخ خضر بن قاضی حمید الدین ناگوری بحسب و نسب از مشائخ عرب است ...... و قاضی مشار الیہ استاد خواجہ قطب الدین اوشی کاکی بود۔"[1]

علی احمد خاں ہاشمی رقمطراز ہیں:-

"شیخ فیضی فیاضی پسر شیخ مبارک است کہ نبائر شیخ حمید الدین ناگوری بودہ۔"[2]

ابو طالب تبریزی اصفہانی مصنف تذکرہ خلاصۃ الافکار لکھتے ہیں:

۱؎ خلاصۃ الکلام قلمی ص ۱۴۶، ۲؎ مخزن الغرائب قلمی ص ۶۳۵

"شیخ فیضی بن شیخ مبارک برادر کلاں شیخ ابوالفضل است کہ دارالانشاء اکبر بادشاہ تعلق بوی داشتہ ونسب نامش بہ قاضی حمید الدین ناگوری کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی است می پیوستہ۔[۱]"

بارہویں صدی ہجری کے مشہور تذکرہ نگار والہ داغستانی نے لکھا ہے:-

"شیخ فیضی بن شیخ مبارک و برادر مہین شیخ ابوالفضل است از اولاد قاضی حمید الدین ناگوری است کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی بودہ۔[۲]"

اس مسئلہ پر خود فیضی کی رائے زیادہ اہم ہوگی، وہ لکھتے ہیں:-

"قاضی حمید الدین ناگوری پور عطاء الدین بخاری در بخارا بزاد۔ در زمان معز الدین سام با پدر بدہلی آمد سہ سال بقضای ناگور پرداخت........ بخواجہ قطب الدین بپیوند دوستی گزید...... شب پنجم رمضان شش صد وچہل وچہار (۶۴۴ھ) بی رنجوری بعالم علوی شتافت خوابگاہ دہلی۔[۳]"

واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں حمید الدین نام کے دو بزرگ گذرے ہیں، ایک قاضی حمید الدین جو تین سال تک ناگور کے قاضی کے عہدہ پر فائز رہے، اور جن کا مزار مہرولی دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مزار کے پائیں ہے، وہ قاضی حمید الدین ناگوری کہلاتے ہیں، دوسرے سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوریؒ جو سلطان العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے پیر بھائی ہیں، ان کا مزار ناگور میں ہے، قاضی حمید الدین ناگوری سہروردی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ اور حضرت زکریا ملتانیؒ، حضرت جلال الدین تبریزیؒ،

[۱] خلاصۃ الافکار قلمی ص ۱۳۴ [۲] ریاض الشعراء قلمی ص ۳۰۸ [۳] آئین اکبری ج ۳ ص ۲۸۱ مطبوعہ نولکشور۔

شیخ سوریؒ، اور حضرت شہاب الدین پیر جگ جوتؒ جیٹھلی ضلع پٹنہ کے پیر بھائی ہیں، یہ سلطان شمس الدین التمش اور قاضی منہاج سراج کے زمانہ میں تھے، ان کا انتقال ۶۴۳ھ میں ہوا، اور شیخ حمید الدین ناگوری نے ناگور (راجپوتانہ) میں ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں انتقال کیا جس طرح ہجرت نبوی کے بعد مہاجرین کے یہاں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ پہلی اولاد نرینہ پیدا ہوئے، اسی طرح دہلی کی فتح کے بعد شیخ حمید الدین ناگوری پہلی اولاد نرینہ ہیں، اصول الطریقۃ اور سرور الصدور ان کی تصانیف ہیں، سرور الصدور ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے پوتے شیخ فرید الدین نے جمع کیا، یہ ناگور کے قریب سوائی کے رہنے والے ہیں، اس لیے بہت سے لوگ ان کو شیخ حمید الدین سوائی بھی کہتے ہیں، ان سے اور حضرت زکریا ملتانیؒ سے فقر و غنا کے مسئلہ پر خط و کتابت ہوتی تھی،

قاضی حمید الدین ناگوری محض ناگور کے قاضی ہونے کی وجہ سے ناگوری مشہور ہوگئے۔ ان کا اصل نام محمد بن عطا بخاری تھا، طوالع الشموس ان کی مشہور تصنیف ہے، ان کا ایک رسالہ عشقیہ ہے، جس میں عشق الٰہی کے مضامین شاعرانہ نثر میں بیان ہوئے ہیں، طوالع الشموس میں اسمائے حسنہ کی شرح تصوف و طریقت کی زبان میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری نے شمس الدین سمرقندی سے فیض حاصل کیا تھا، اور معز الدین سام کے زمانہ میں اپنے والد کے ساتھ بخارا سے دہلی آئے تھے، دہلی سے ناگور کی قضا پر مامور کیے گئے، یہاں سے بغداد تشریف لے گئے، اور یہاں سے حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ گئے، وہاں سے واپس ہوکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے، اور ان ہی کے ساتھ رہنے لگے، وہ سماع کے بڑے دلدادہ تھے، اور سلطان شمس الدین التمش کے

عہد حکومت میں علما کی مخالفت کے باوجود بادشاہ وقت سے اس کی اجازت لے لی تھی، دہلی میں سماع کا آغاز ان ہی کی آمد کے بعد سے ہوا،

بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے استاد تھے، لیکن اس بارے میں تحقیق سے کچھ کہنا مشکل ہے، قطب صاحب کی پیدائش کا سال ۵۸۲ھ اور وفات کا سال ۶۳۳ھ ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری شیخ خضر کے والد اور فیضی کے پردادا ہیں، جو قرین قیاس بھی نہیں ہے، صرف "ناگوری" کی نسبت کے سبب سے تذکرہ نگاروں کو مغالطہ ہوگیا ہے، قاضی صاحب اور ان کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے، اور فیضی کے اسلاف کا وطن یمن تھا، اگر فیضی کے خاندان سے ان کا تعلق ہوتا تو شیخ ابو الفضل نے آئین اکبری کے خاتمہ میں جہاں اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، ان کا ذکر ضرور کرتا، اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری کا فیضی کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

بزم صوفیہ

عہد تیموری سے پہلے کے صاحب تصنیف صوفیائے کرام مثلاً حضرت شیخ علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، خواجہ نظام الدین اولیا، بو علی قلندر پانی پتی، شرف الدین احمد منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت سید محمد گیسو دراز وغیرہ کے حالات و تعلیمات کی تفصیل، ان کے ملفوظات اور تصنیفات کی روشنی میں،

اس کا دوسرا اڈیشن بکثرت اضافوں کے ساتھ زیر طبع ہے، جو اس مہینہ کے آخر تک چھپ جائیگا، اس میں حضرت مخدوم عبدالحق ردولوی کے حالات بڑھائے گئے ہیں۔

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق ثنا انصاری

اہل چمن کے کیوں نہ لگے تن بدن میں آگ
جب باغباں لگائے خود اپنے چمن میں آگ

دار و رسن کی نذر کریں جاں نہ ہم نہیں
ہم وہ ہیں جو لگاتے ہیں دار و رسن میں آگ

اس شان سے ہیں ہم سوئے منزل رواں دواں
صحرا میں جیسے تند ہوا، جیسے بن میں آگ

محفل میں انجماد تھا جبتک تھے ہم خموش
ہم لب کشا ہوئے تو لگی انجمن میں آگ

غنچہ کے رنگ پر بھی ذرا ڈالیے نظر
یہ بھی تو دیکھئے ہے لب خندہ زن میں آگ

کیا شکوۂ عداوت اغیار کیجئے
اہل وطن جب آپ لگائیں وطن میں آگ

جلتا رہے گا تا بہ ابد آدم حزیں
روز ازل لگی تھی دل اہرمن میں آگ

پیشانیاں جو رہتی تھیں اب تک عرق سے تر
پوشیدہ آج ان کی ہے ہر ہر شکن میں آگ

ابھریں گے شعلہ بن کے کبھی یہ لہو کے داغ
زیر زمیں بھی ہم ہیں چھپائے کفن میں آگ

جو اتصال تیشہ و خارا کی دین ہو
کچھ اس سے مختلف ہو دل کوہکن میں آگ

سوز دروں سے اپنی تو ہستی ہی جل گئی
پھیلی جو شہر دل سے لگی ملک تن میں آگ

ہم دل جلوں کی تلخیٔ گفتار ہو معاف
سینہ سے بڑھ کے آگئی کام و دہن میں آگ

کس نے عطا کیا ہے اسے سوز دل ثنا
آئی کہاں سے لالۂ خوں پیرہن میں آگ

غزل

از

جناب عروج زیدی رامپور

شورش و فتنہ و بیداد و ستم جاگے ہیں
اک قیامت سی جلو میں ہے جو ہم جاگے ہیں

راہِ منزل میں چراغاں! غلط اندیشی ہے
رہ نمائی کو مرے نقشِ قدم جاگے ہیں

اب کھلی ہیں غمِ دوراں سے ہماری آنکھیں
وہ الگ بات ہے جو ہم شبِ غم جاگے ہیں

خوابِ راحت میں تھے ہم جب تھا مقدر بیدار
اب جو جاگے ہیں تو با دیدۂ نم جاگے ہیں

میری تکبیر نے وحدت کا بھرم رکھا ہے
کلمہ پڑھتے ہوئے اصنامِ حرم جاگے ہیں

ضبط تحریر میں لاتا ہے انھیں خونِ جبین
ورنہ کیا بات ہے کیوں لوح و قلم جاگے ہیں

خود فریبی ہے کہ افسونِ گراں خوابی ہے
نیند کے ماتے یہ کہتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

بے خبر سوتے تھے آغوشِ رواداری میں
آج بھی تم نے جگایا ہے تو ہم جاگے ہیں

میں نے بخشی ہے انھیں دولتِ احساس عروج
بے نیازی سے مری، اہلِ کرم جاگے ہیں

نوائے عصر

نوائے حیات کے بعد جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعۂ کلام جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے قلم سے پیش لفظ اور مولانا شاہ معین الدین احمد کے قلم سے تعارف ہے۔

قیمت عہ

مطبوعاتِ جدیدہ

اتحاف النبیہ فیما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، ترتیب تحشیہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، تقطیع متوسط، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات: ۱۶۴، قیمت: عمر، پتہ:- المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور، نمبر ۲ پاکستان

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف الانتباہ من سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ کا جو علم ظاہر و باطن کے سلاسل و اسناد پر مشتمل ہے، پہلا جزء جو سلاسل تصوف کے بیان میں ہے، مع عربی متن اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے، لیکن دوسرا جزء غیر مطبوعہ اور نایاب تھا، پاکستان کی جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم مولانا عطاء اللہ حنیف کو حسن اتفاق سے اس کا وہ نسخہ دستیاب ہوگیا، جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن، اور اُن کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی نظر سے گذر چکا تھا، مگر یہ ناقص تھا، دوسرا مکمل نسخہ مشہور فاضل مولانا عبد الرشید نعمانی کے یہاں سے فراہم کرکے اس کو ضروری حواشی اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اس جزء میں حدیث و فقہ کی اہم اور متداول کتابوں کے اُن کے مصنفین تک اسناد و اجازات درج کئے گئے جو شاہ صاحب کو اُن کے شیوخ و اساتذہ اور اُنکو اُنکے شیوخ و اساتذہ نے دئے تھے، اسکے علاوہ اس میں حدیث و فقہ کے متعلق دوسرے مفید معلومات بھی ہیں، خصوصاً کتب حدیث کے طبقات اور تقلید و اجتہاد پر پُر مغز اور جامع

بحث کی گئی ہے، فاضل مرتب نے تصحیح میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا ہے، اور شاہ صاحب اور اُن کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی تصنیفات اور دوسری جن کتابوں میں اس قسم کے مباحث مذکور ہیں، اس کی تصحیح میں ان سب سے استفادہ کیا ہے، حواشی میں متن کے اسماء و اعلام اور کتابوں کے متعلق معلومات اور مقدمہ میں سند و اسناد اور بعض مصطلحات فن کی تشریح و تعریف، علم اسناد کی دینی اہمیت و ضرورت کی وضاحت اور شاہ صاحب تک مرتب نے اپنے اسناد تحریر کئے ہیں، آخر میں مراجع و مصادر کا مکمل انڈکس بھی ہے، اس نادر و کمیاب علمی و دینی کتاب کی اشاعت پر لائق مرتب اور مکتبہ سلفیہ دونوں اہل علم کی تبریک کے مستحق ہیں،

گل رعنا۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، پتہ: علمی مجلس، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دہلی ۶۔

مرزا غالب مرحوم نے کلکتہ میں قیام کے زمانہ میں اپنے ایک عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اردو و فارسی کلام کا ایک انتخاب گل رعنا کے نام سے کیا تھا، یہ اولین انتخاب مفقود و معدوم تھا، چند سال پہلے حیدر آباد کے بلگرامی خاندان میں اس کا مکمل خطی نسخہ مشہور محقق اور ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب کو مل گیا، جس کو انھوں نے بڑے اہتمام سے ایک مفید مقدمہ اور تحقیقی حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، اس مجموعہ میں غالب کی ایک سو سولہ اردو اور ستائیس فارسی غزلوں کے انتخاب کے علاوہ ان ہی کے قلم سے ایک دیباچہ و خاتمہ جو فارسی زبان میں ہیں، شامل ہیں، حسن اتفاق سے گذشتہ سال گل رعنا کا وہ نسخہ بھی لاہور میں مل گیا، جو خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، فاضل مرتب نے غالب کے مختلف متداول و غیر متداول دواوین کے علاوہ اس سے بھی ترتیب و تحشیہ میں مدد لی ہے، حواشی دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، اور ان میں مختلف نسخوں کے اختلاف کو واضح

کیا گیا ہے، مقدمہ میں غالب کے کلکتہ کے سفر اور گل رعنا کی دستیابی کی دلچسپ روداد اور غالب اور ان کے مختلف دواوین کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، لیکن مقدمہ اور مرتب کی بعض دوسری تحریروں میں کہیں کہیں تضاد ہو گیا ہے، مثلاً مقدمہ میں انھوں نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے متعلق لکھا ہے کہ "انھیں شعر و سخن سے کوئی واسطہ نہ تھا"، نیز ایک مولوی کی جسے شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا" حالانکہ اس مولوی کی سخن فہمی کی غالب نے خود اپنے قصائد میں تعریف کی ہے، اور لائق مرتب نے بھی ذکر غالب میں ص ۴۴، ۴۵ پر لکھا ہے کہ "شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، اور غالب ان کے پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے"، مقدمہ میں انھوں نے آزاد کی روایت کو بالکل مہمل قرار دیا ہے، مگر ذکر غالب میں اس کے اس جز سے اتفاق کیا ہے کہ مولوی صاحب اور مرزا خانی کوتوال کے کہنے پر غالب نے اپنا رنگ سخن بدل دیا تھا، اسی طرح یہاں غالب کی دلی سے کلکتہ کی روانگی نومبر یا دسمبر ۱۸۲۶ء میں درج ہے، عیار غالب میں دسمبر ۱۸۲۶ء اور ذکر غالب میں "غالباً اگست ۱۸۲۶ء" لکھی گئی ہے، تعجب ہے کہ غالبیات کے ایک دیدہ ور ماہر کے قلم سے اس قسم کی متضاد باتیں کس طرح نکل گئی ہیں، نسخہ حمیدیہ کو بالکل ساقط الاعتبار کہنا بھی عجیب ہے، جب کہ خود مرتب کو بھی اعتراف ہے کہ "سال بھر پہلے تک اردو دیوان کا یہی قدیم ترین نسخہ تھا" اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں ایک اہم اور مفید اضافہ ہوا ہے۔

مجلہ سیفیہ غالب نمبر: مرتبہ جناب متین نیّد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۳۰، قیمت درج نہیں، پتہ شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال۔

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو نے بھی غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں کالج میگزین کا غالب نمبر شائع کیا ہے، جو بڑے سلیقہ اور خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے، اس میں غالب کے فن اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر متنوع اور دلکش مضامین اور چند منظومات شامل ہیں

غالب کی بعض تحریروں کا عکس، اور اردو کلام کا مختصر انتخاب بھی دیا گیا ہے، کالج کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ کئی مشہور اہل قلم کے مضامین بھی ہیں، اس نمبر میں اہم اور قابلِ ذکر مضمون جناب عبدالقوی دسنوی صدر شعبۂ اردو کے قلم سے "نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی" ہے، اس میں بھوپال سے دریافت ہونے والے دیوانِ غالب کے دو قلمی نسخوں یعنی نسخۂ حمیدیہ جو ۱۹۱۸ء میں دریافت اور ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا، اور دوسرا گذشتہ سال غالب صدی کی دھوم دھام میں نو دریافت نسخہ جو دیوانِ غالب بخط غالب نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے رام پور اور نقوش لاہور غالب نمبر حصۂ دوم میں "بیاضِ غالب" کے نام سے شائع ہوا ہے"، کے متعلق اصحابِ علم و ادب کے بیانات اور تحریریں جمع کر کے مفصل معلومات اور ان سب اشعار کا ذکر ہے، جن پر مرزا نے اپنے قلم سے اصلاحات کی ہیں گو حال میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے "نسخۂ بھوپال ثانی" کے جس کا بخط غالب ہونا تقریباً مسلّم سمجھا جاتا تھا، بارہ میں متعدد شبہات وارد کئے ہیں، تاہم اس سے دسنوی صاحب کی محنت و کاوش میں کوئی فرق نہیں آتا، ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "غالب کا صحیفۂ منسوخ" بھی، نو کھے طرز کا دلچسپ ہے، سید حیدر عباس رضوی اور ڈاکٹر سید حامد حسین کے مضامین بھی خاصے ہیں، البتہ پروفیسر مجیب صاحب کے مضمون میں غالب کی آزاد مشربی اور اباحیت کو جن الفاظ میں سراہا گیا ہے، وہ ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امیر کی شان سے فروتر بھی ہے، اور غیر ضروری بھی، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر غالب پر شائع ہونے والے اچھے نمبروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔

(ض)